وما ینطق عن الھوٰی ان ھو الا وحی یوحٰی

وہ اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتے، جو بھی کہتے وہ وحی ہے جو اُن پر نازل کی جاتی ہے۔

عظمتِ حدیث

حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ....

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد آپ لوڈ (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشرواشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

☆ تنبیه ☆

- کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔

﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾

- نشرواشاعت، کتب کی خرید و فروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

kitabosunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

عظمتِ حدیث

حافظ صلاح الدین یوسف

دار السلام
کتاب وسنت کی اشاعت کا عالمی ادارہ
DARUSSALAM
ریاض • جدہ • شارجہ • لاهور • کراچی
اسلام آباد • لندن • هیوسٹن • نیو یارك

کتاب وسنت کی اشاعت کا عالمی ادارہ

سعودی عرب (ہیڈ آفس)

پوسٹ بکس: 22743 الریاض: 11416 سعودی عرب فون: 00966 1 4043432-4033962

فیکس: 4021659 E-mail: darussalam@awalnet.net.sa

Website: www.dar-us-salam.com

❶ طریق مکہ۔ العلیا۔ الریاض فون: 00966 1 4614483 فیکس: 4644945

❷ شارع البعین۔ الملز۔ الریاض فون: 4735220 فیکس: 4735221

❸ جدہ فون: 00966 2 6879254 فیکس: 6336270

❹ الخبر فون: 00966 3 8692900 فیکس: 8691551

شارجہ فون: 00971 6 5632623 فیکس: 5632624

لندن فون: 0044 20 85394885 فیکس: 020 85394889

امریکہ ❶ ہوسٹن فون: 001 713 7220419 فیکس: 7220431

❷ نیویارک فون: 001 718 6255925 فیکس: 6251511

پاکستان (ہیڈ آفس و مرکزی شوروم)

❶ 36- لوئر مال، سیکرٹریٹ سٹاپ، لاہور

فون: 7110081-7111023-7232400-7240024 0092 42 فیکس: 7354072

Website: www.darussalampk.com E-mail: info@darussalampk.com

❷ غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور فون: 7120054 فیکس: 7320703

❸ مون مارکیٹ اقبال ٹاؤن۔ لاہور فون: 7846714

کراچی شوروم Z-110,111 (D.C.H.S) مین طارق روڈ (بالمقابل فری پورٹ شاپنگ مال) کراچی

فون: 0092-21-4393936 فیکس: 4393937

Email: darussalamkhi@darussalampk.com

اسلام آباد شوروم F-8 مرکز، اسلام آباد فون: 051-2500237

مضامین

3

4

5

6

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو نہایت مہربان، بہت رحم کرنے والا ہے

عرضِ ناشر

قرآن کے بغیر دین اسلام کے علم کا تصور محال ہے۔اسی طرح شارح قرآن کے بغیر قرآن کا علم حاصل نہیں ہوسکتا۔اسی لیے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے قرآن اور حدیث میں کوئی فرق روا نہیں رکھا۔ان نفوس قدسیہ کے نزدیک نہ صرف دونوں واجب الاطاعت تھے بلکہ انھوں نے عملاً یہ ثابت کر دیا کہ ان کے نزدیک احادیث احکام قرآن ہی کا تسلسل تھیں۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ان فیصلوں کو جو قرآن کریم میں منصوص نہیں، کتاب اللہ ہی کے فیصلے قرار دیا، مثلاً شادی شدہ زانی کے لیے حد رجم، نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے عموم میں تخصیص کر کے صادر فرمائی اور اسے ''کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ'' قرار دیا۔

تاریخ اسلام میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا دور غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔اس دوران میں ان کے مابین اگر کبھی اختلاف پیدا ہوا تو حدیث رسول معلوم ہوتے ہی وہ اختلاف ختم ہو گیا کیونکہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم حدیث کو اسی طرح حجت تسلیم کرتے تھے جس طرح قرآن کو۔اور یہ حقیقت اسلام مخالف عناصر بھی تسلیم کرتے ہیں۔دونوں کو یکساں اہمیت دینے ہی کا نتیجہ تھا کہ یہ دور پوری تاریخ اسلام کا درخشاں ترین اور لائق تقلید دور قرار پایا۔نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشینی اور تدفین پر صحابۂ کرام میں شدید اختلاف ابھرا۔مسئلہ حل کرنے کے لیے گفتگو جاری رہی اور

جونہی حدیث سامنے آئی یہ اہم اور نازک مسئلہ آن واحد میں حل ہو گیا۔

زیر نظر کتاب "عظمت حدیث" کے مضامین میں فاضل مؤلف حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ نے اسی بنا پر منکرین حدیث کو اپنے اولین مخاطب قرار دیا جو حدیث کو ماخذ دین تسلیم نہیں کرتے۔ اور اپنے مخصوص تحقیقی اور داعیانہ انداز میں حدیث کو بنی نوع انسان کی لازمی اور لابدی ضرورت ثابت کیا ہے۔ مصنف کی یہ دلیل برہان قاطع کی حیثیت رکھتی ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم، ان کے بعد تابعین و تبع تابعین اور ائمہ محدثین کے ادوار میں حدیث کی تشریعی حیثیت مسلمہ رہی بلکہ کوئی دور ایسا نہیں گزرا کہ اہل سنت والجماعت میں یہ مسئلہ مختلف فیہ رہا ہو۔ حدیث کی اس تشریعی اہمیت ہی کے باعث "اللہ تعالیٰ نے تکوینی طور پر محدثین کا ایسا بے مثال گروہ پیدا فرمایا جس نے حدیث رسول کی حفاظت کا ایسا سر و سامان کیا کہ انسانی عقلیں ان کاوشوں کو دیکھ کر دنگ رہ گئیں۔ اور محدثین نے حدیث رسول کی تہذیب و تنقیح کے لیے ایسے علوم ایجاد کیے جو مسلمانوں کے لیے سرمایہ صد افتخار ہیں۔ اگر حدیث رسول کی یہ تشریعی اہمیت نہ ہوتی جس طرح کہ آج کل باور کرایا جا رہا ہے تو سوچنے کی بات یہ ہے کہ محدثین رحمہم اللہ کو حفاظت حدیث کے لیے اتنی عرق ریزی اور جگر کاوی کی ضرورت کیا تھی؟"

اس طرز استدلال سے منکرین حدیث اور عام قارئین پر حجیت حدیث کی حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہو جائے گی کہ "نبی اکرم ﷺ کی حیثیت مطاع و متبوع، قرآن کے معلم و مبین اور حاکم و حکم کی ہے، اس لیے آپ ﷺ کے جو فرامین صحیح سند سے ثابت ہیں وہ دین میں حجت اور اس طرح واجب الاطاعت ہیں جس طرح قرآنی احکام پر عمل کرنا اہل ایمان کے لیے ضروری ہے۔" اور اگر بعض عناصر "میں نہ مانوں" کی روش پر قائم رہتے ہیں تو غیر جانبدار قاری یقیناً اس نتیجے پر پہنچے گا کہ دراصل یہ عناصر علمی اختلاف رائے کے بجائے کسی اور نوع کے "اختلاف" میں مبتلا ہیں۔ اور انھیں اپنا نقطہ نظر بیان کرنے کے لیے مضامین کسی اور طرف سے آ رہے ہیں۔

حدیث کی تشریعی حیثیت کے منکرین کے علاوہ فاضل مؤلف نے حدیث کے بارے میں اہل تقلید کے طرزِ عمل کے نقصانات کا جائزہ لیا ہے اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی مسند کے ''جانشین حضرات'' کو شاہ صاحب ہی کی زبان میں تفہیم کی شاندار کاوش کی ہے۔ مصنف کے نزدیک بعض اہل حدیث حضرات کا طرزِ عمل بھی غیر محدثانہ روش کا آئینہ دار ہے۔ اس طرزِ عمل کا جائزہ لینے کے بعد امن وسلامتی کی راہ اپنانے کے رہنما خطوط پیش کیے گئے ہیں اور کہا گیا ''یہ راہ نصوص شریعت کی برتری کو ماننے اور قائم رکھنے کی راہ ہے۔''

اس کتاب کی تخریج تسہیل اور پروف خوانی میں حافظ آصف اقبال، محمد عثمان منیب اور محمد فاروق حفظہم اللہ نے نہایت محنت اور خلوص سے اپنی ذمہ داریاں نبھائیں۔ ڈیزائننگ اور کمپوزنگ میں زاہد سلیم چودھری، ہارون الرشید، اور ابو مصعب نے دلجمعی، فرض شناسی اور محنت سے خدمات انجام دیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری اس کاوش کو منظور ومقبول فرمائے۔ آمین یا رب العالمین!

خادم کتاب وسنت

عبدالمالک مجاہد

مدیر: دارالسلام۔ ریاض، لاہور

رمضان المبارک 1427ھ / اکتوبر 2006ء

عرضِ مؤلف

یہ کتاب چند مضامین کا مجموعہ ہے جن کے مخاطب مختلف قسم کے لوگ ہیں۔

ان میں سے اولین مخاطَب، منکرینِ حدیث کا گروہ ہے جو حدیث کی تشریعی حیثیت اور اس کے ماخذ دین ہونے کا منکر ہے دراں حالیکہ حدیث کے بغیر نہ قرآن کو سمجھا جا سکتا ہے اور نہ دین اسلام پر عمل ہی کیا جا سکتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ گروہ حدیث کا انکار کر کے دراصل اسلام کی عمارت کو ڈھانا چاہتا ہے۔

دوسرے نمبر پر مخاطَب، اہل تقلید ہیں۔ یہ حضرات حدیث کی حجیت کے تو قائل ہیں، لیکن حدیث کو اس طرح قرار واقعی اہمیت نہیں دیتے جیسے اس کا حق ہے۔ یہ حضرات قولِ امام کو اولیت اور حدیث کو ثانوی حیثیت دیتے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ یہ طرز عمل بھی ایک مسلمان کے شایانِ شان نہیں، علاوہ ازیں اس سے رسول اللہ ﷺ کی حیثیت رسالت بھی مجروح ہوتی ہے۔

تیسرے نمبر پر مخاطَب، بعض اہل حدیث حضرات ہیں، جن کا رویہ بعض معاملات میں محدثانہ روش کے خلاف ہے۔ اور وہ بعض ضعیف احادیث پر عمل کرنے پر اس لیے اصرار کرتے ہیں کہ بعض بزرگوں کا ان پر عمل رہا ہے یا انھوں نے ان احادیث کو اپنی کتابوں میں درج کیا ہے۔

چوتھے نمبر پر تمام مسلمان اور ہر مکتب فکر کے لوگ مخاطب ہیں۔ ان کو یہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ کتب احادیث کا مطالعہ فقہی تعصب اور موروثی مسلک کی عینک اتار کر کریں، تاکہ اس حسن نیت اور اخلاص کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی مدد ان کے شامل حال رہے۔ یہ طریقۂ مطالعہ ان شاء اللہ ان کے لیے ہدایت اور راہِ صواب پانے کا ذریعہ اور اُخروی سعادت کا باعث ہوگا۔

مقصد ان سب کے سامنے حدیث کی عظمت اور اس کے تقاضوں کو واضح کرنا ہے، جس کی تفصیل قارئین کرام اس کتاب میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو حدیث کی عظمت اور اس کے تقاضوں کو سمجھنے اور اس کے مطابق عمل کرنے کی توفیق ارزانی فرمائے۔

حافظ صلاح الدین یوسف

مدیر شعبۂ تحقیق وتالیف وترجمہ دارالسلام، لاہور

۱۴۰/۱۲۴، شاداب کالونی، علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو۔ لاہور

فون: ۶۳۱۶۹۳۱۔ رجب المرجب ۱۴۲۷ھ۔ اگست ۲۰۰۶ء

1

حدیث رسول قرآن ہی کی طرح شریعت کا ماخذ اور حجت ہے

اَدِلّہء شرعیہ اور مصادرِ شریعت کے تذکرے میں قرآنِ کریم کے بعد حدیثِ رسول کا نمبر آتا ہے، یعنی قرآنِ کریم کے بعد شریعتِ اسلامیہ کا یہ دوسرا ماخذ ہے۔ حدیث کا اطلاق رسول اللہ ﷺ کے اقوال، افعال اور تقریرات پر ہوتا ہے۔ تقریر سے مراد ایسے امور ہیں جو نبیء کریم ﷺ کی موجودگی میں کیے گئے لیکن آپ نے اس پر کوئی نکیر نہیں فرمائی بلکہ خاموش رہ کر اس پر اپنی پسندیدگی کا اظہار فرما دیا۔ ان تینوں قسم کے علومِ نبوت کے لیے بالعموم چار الفاظ استعمال کیے گئے ہیں: (1) خبر (2) اثر (3) حدیث (4) اور سنت۔

خبر

ویسے تو ہر واقعے کی اطلاع اور حکایت کو کہا جاتا ہے، مگر رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کے لیے بھی ائمہء کرام اور محدثین عظام نے اس کا استعمال کیا ہے اور اس وقت یہ لفظ حدیث کے

مترادف اوراخبار الرسول کے ہم معنی ہوگا۔

اثر

کسی چیز کے بقیہ اور نشان کو کہتے ہیں، اور نقل کو بھی اثر کہا جاتا ہے۔اسی لیے صحابہ وتابعین سے منقول مسائل کو آثار کہا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب آثار کا لفظ مطلقاً بولا جائے گا تو اس سے مراد آثارِ صحابہ ہی ہوں گے۔لیکن جب اس کی اضافت،الرسول، کی طرف ہو گی یعنی'' آثارالرسول'' کہا جائے گا تو أخبارالرسول کی طرح آثار الرسول بھی أحادیث الرسول ہی کے ہم معنی ہوگا۔

حدیث
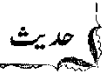
اس کے معنی گفتگو کے ہیں اور اس سے مراد وہ گفتگو اور ارشادات ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے نکلے۔

سنت

عادت اور طریقے کو کہتے ہیں اور اس سے مراد عادات واطوارِ رسول ﷺ ہیں، اس لیے جب سنت نبوی یا سنت رسول کہیں گے تو اس سے مراد نبی ﷺ ہی کے عادات واطوار ہوں گے۔

اوّل الذکر دولفظوں (خبر اور اثر) کے مقابلے میں ثانی الذکر الفاظ (حدیث اور سنت) کا استعمال علومِ نبوت کے لیے عام ہے اور اس میں اتنا خصوص پیدا ہوگیا ہے کہ جب بھی حدیث یا سنت کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے مراد نبی ﷺ کے اقوال وافعال اور تقریرات ہی مراد ہوتے ہیں۔اس مفہوم کے علاوہ کسی اور طرف ذہن منتقل ہی نہیں ہوتا۔اگر چہ بعض لوگوں نے حدیث اور سنت کے مفہوم میں بھی فرق کیا ہے کہ سنت سے مراد رسول اللہ ﷺ کے

اعمال و عادات ہیں اور حدیث سے مراد اقوال۔ اور بعض لوگوں نے اس سے بھی تجاوز کر کے یہ کہا کہ آپ کے اعمال و عادات عرب کے ماحول کی پیداوار تھیں اس لیے ان کا اتباع ضروری نہیں، صرف آپ کے اقوال قابل اتباع ہیں۔ اسی طرح بعض لوگوں نے اس کے برعکس یہ کہا کہ آپ کے اقوال پر عمل ضروری نہیں، جسے وہ حدیث سے تعبیر کرتے ہیں، تاہم آپ کے اعمالِ مستمرّہ (دائمی اعمال) قابل عمل ہیں، اسے وہ سنت کہتے ہیں۔ لیکن یہ سب باتیں صحیح نہیں۔ محدثین نے سنت اور حدیث کے مفہوم کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا ہے۔ وہ سنت اور حدیث دونوں کو مترادف اور ہم معنی سمجھتے ہیں۔ اسی طرح سنت سے صرف عادات و اطوار مراد لے کر ان کی شرعی حجیت سے انکار بھی غلط ہے اور انکارِ حدیث کا ایک چور دروازہ۔ اور اسی طرح صرف اعمال مستمرہ کو قابل عمل کہنا، احادیث کے ایک بہت بڑے ذخیرے کا انکار ہے اور منکرین حدیث کی بہ انداز دیگر ہم نوائی۔

بہرحال حدیث اور سنت، رسول اللہ ﷺ کے اقوال، افعال اور تقریرات کو کہا جاتا ہے۔ اور یہ بھی قرآن کریم کی طرح دین کا ماخذ، شریعت کا مصدر اور مستقل بالذات قابل استناد ہے۔ چنانچہ امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«اِعْلَمْ أَنَّهُ قَدِ اتَّفَقَ مَنْ يُّعْتَدُّ بِهِ مِنْ أَهْلِ الْعِلْمِ عَلٰى أَنَّ السُّنَّةَ الْمُطَهَّرَةَ مُسْتَقِلَّةٌ بِتَشْرِيعِ الْأَحْكَامِ وَأَنَّهَا كَالْقُرْآنِ فِي تَحْلِيلِ الْحَلَالِ وَتَحْرِيمِ الْحَرَامِ»

”معلوم ہونا چاہیے کہ اہل علم کا اس بات پر اتفاق ہے کہ سنت مطہرہ تشریع احکام میں مستقل حیثیت کی حامل ہے اور کسی چیز کو حلال قرار دینے یا حرام کرنے میں اس کا درجہ قرآن کریم ہی کی طرح ہے۔“[1]

---

[1] إرشاد الفحول، ص: 33

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں:

«إِنَّ ثُبُوتَ حُجِّيَّةِ السُّنَّةِ الْمُطَهَّرَةِ وَاسْتِقْلَالَهَا بِتَشْرِيعِ الأَحْكَامِ ضَرُورَةٌ دِينِيَّةٌ وَّلَا تُخَالِفُ فِي ذٰلِكَ إِلَّا مَنْ لَّا حَظَّ لَهُ فِي دِينِ الْإِسْلَامِ»

''سنت مطہرہ کی حجیت کا ثبوت اور تشریع احکام میں اس کی مستقل حیثیت ایک اہم دینی ضرورت ہے اور اس کا مخالف وہی شخص ہے جس کا دین اسلام میں کوئی حصہ نہیں۔''[1]

سنت کا مستقل حجتِ شرعی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ نبی ﷺ کی صحیح حدیث سے جو حکم ثابت ہو، وہ مسلمان کے لیے قابل اطاعت ہے، چاہے اس کی صراحت قرآن میں ہو یا نہ ہو۔ آپ کے صرف وہی فرمودات قابل اطاعت نہیں ہوں گے جن کی صراحت قرآن کریم میں آ گئی ہے جیسا کہ گمراہ فرقوں نے کہا ہے اور اس کے لیے ایک حدیث بھی گھڑ لی کہ ''میری بات کو قرآن پر پیش کرو، جو اس کے موافق ہو اسے قبول کر لو اور جو اس کے مخالف ہو اسے رد کر دو۔''[2] بلکہ رسول اللہ ﷺ کے ہر فرمان پر عمل کرنا ضروری ہے بشرطیکہ وہ صحیح سند سے ثابت ہو۔

اس لیے کسی بھی حدیثِ رسول کو ظاہر قرآن کے خلاف باور کرا کے اسے رد کرنا اہل اسلام کا شیوہ نہیں۔ یہ طریقہ صرف اہل زیغ اور اہل اہواء کا ہے جنھوں نے موافقتِ قرآن کے

---

① إرشاد الفحول، ص: 33

② امام شوکانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: فَقَالَ يَحْيَى بْنُ مَعِينٍ : إِنَّهُ مَوْضُوعٌ وَضَعَتْهُ الزَّنَادِقَةُ (إرشاد الفحول، ص: 33) ''امام یحییٰ بن معین کہتے ہیں کہ قرآن پر حدیث کو پیش کرنے والی روایت موضوع ہے جسے بے دینوں نے گھڑا ہے۔''

خوش نما عنوان سے بے شمار احادیثِ رسول کو ٹھکرا دیا۔ چنانچہ امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ (المتوفی 463 ہجری) لکھتے ہیں:

«وَقَدْ أَمَرَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ بِطَاعَتِهٖ وَاتِّبَاعِهٖ أَمْرًا مُّطْلَقًا مُّجْمَلاً وَّلَمْ يُقَيِّدْ بِشَيْءٍ وَّلَمْ يَقُلْ مَا وَافَقَ كِتَابَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ بَعْضُ أَهْلِ الزَّيْغِ»

''اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی اطاعت کا مطلقاً حکم فرمایا ہے اور اسے کسی چیز سے مقید (مشروط) نہیں کیا ہے اور اللہ نے یہ بھی نہیں کہا کہ نبی ﷺ کی بات تم اس وقت مانو جب وہ اللہ کی کتاب کے موافق ہو، جس طرح کہ بعض اہل زیغ کہتے ہیں۔''[1]

اور امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«إِنَّ قَوْلَ مَنْ قَالَ تُعْرَضُ السُّنَّةُ عَلَى الْقُرْآنِ، فَإِنْ وَافَقَتْ ظَاهِرَهُ وَإِلَّا اسْتَعْمَلْنَا ظَاهِرَ الْقُرْآنِ وَتَرَكْنَا الْحَدِيثَ، جَهْلٌ»

یعنی ''قبولیتِ حدیث کو موافقتِ قرآن سے مشروط کرنا جہالت (قرآن و حدیث سے بے خبری) ہے۔''[2]

اور امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«وَالسُّنَّةُ مَعَ الْقُرْآنِ عَلٰى ثَلَاثَةِ أَوْجُهٍ: أَحَدُهَا: أَنْ تَكُونَ مُوَافِقَةً مِّنْ كُلِّ وَجْهٍ، فَيَكُونُ تَوَارُدُ الْقُرْآنِ وَالسُّنَّةِ عَلَى الْحُكْمِ الْوَاحِدِ مِنْ بَابِ تَوَارُدِ الْأَدِلَّةِ وَتَظَافُرِهَا، اَلثَّانِي: أَنْ تَكُونَ بَيَانًا لِّمَا أُرِيدَ بِالْقُرْآنِ وَتَفْسِيرًا لَّهُ، اَلثَّالِثُ: أَنْ تَكُونَ مُوجِبَةً لِّحُكْمٍ سَكَتَ الْقُرْآنُ عَنْ إِيجَابِهٖ أَوْ مُحَرِّمَةً لِّمَا سَكَتَ عَنْ تَحْرِيمِهٖ، وَلَا تَخْرُجُ

① جامع بیان العلم و فضلہ: 190/2

② اختلاف الحدیث برحاشیہ کتاب الأم: 45/7، دارالشروق، بیروت

عَنْ هٰذِهِ الأَقْسَامِ فَلَا تُعَارِضُ الْقُرْآنَ بِوَجْهٍ مَّا ، فَمَا كَانَ مِنْهَا زَائِدًا عَلَى الْقُرْآنِ فَهُوَ تَشْرِيعٌ مُّبْتَدَأٌ مِّنَ النَّبِيِّ ﷺ تَجِبُ طَاعَتُهُ فِيهِ ، وَلَا تَحِلُّ مَعْصِيَتُهُ وَلَيْسَ هٰذَا تَقْدِيمًا لَّهَا عَلٰى كِتَابِ اللهِ بَلِ امْتِثَالٌ لِّمَا أَمَرَ اللهُ بِهِ مِنْ طَاعَةِ رَسُولِهِ وَلَوْ كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ لَا يُطَاعُ فِي هٰذَا الْقِسْمِ لَمْ يَكُنْ لِطَاعَتِهِ مَعْنًى ، وَسَقَطَتْ طَاعَتُهُ الْمُخْتَصَّةُ بِهِ وَإِنَّهُ إِذَا لَمْ تَجِبْ طَاعَتُهُ إِلَّا فِيمَا وَافَقَ الْقُرْآنَ ، لَا فِيمَا زَادَ عَلَيْهِ لَمْ يَكُنْ لَّهُ طَاعَةٌ خَاصَّةٌ تَخْتَصُّ بِهِ وَقَدْ قَالَ تَعَالَى : ﴿مَّن يُطِعِ ٱلرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ ٱللَّهَ ۖ وَمَن تَوَلَّىٰ فَمَآ أَرْسَلْنَٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا﴾ »

یعنی ''حدیثی احکام کی تین صورتیں ہیں:

- ایک تو وہ جو من کل الوجوہ قرآن کے موافق ہیں۔
- دوسرے، وہ جو قرآن کی تفسیر اور بیان کی حیثیت رکھتے ہیں۔
- تیسرے، وہ جن سے کسی چیز کا وجوب یا اس کی حرمت ثابت ہوتی ہے حالانکہ قرآن میں اس کے وجوب یا حرمت کی صراحت نہیں۔

احادیث کی یہ تینوں قسمیں قرآن سے معارض نہیں ہیں۔ جو حدیثی احکام زائد علی القرآن ہیں، وہ نبی ﷺ کی تشریعی حیثیت کو واضح کرتے ہیں، یعنی ان کی تشریع وتقنین (قانون سازی) آپ ﷺ کی طرف سے ہوئی ہے جس میں آپ کی اطاعت واجب اور نافرمانی حرام ہے۔ اور اسے تقدیم علیٰ کتاب اللہ بھی نہیں کہا جا سکتا بلکہ یہ اللہ کے اس حکم کی فرماں برداری ہے جس میں اس نے اپنے نبی ﷺ کی اطاعت کا حکم دیا ہے۔ اگر اس (تیسری) قسم میں نبیٔ کریم ﷺ کی اطاعت نہ کی جائے اور یہ کہا جائے کہ آپ کی اطاعت صرف انہی باتوں میں کی جائے گی جو قرآن کے موافق

ہوں گی تو آپ کی اطاعت کا حکم بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے اور آپ کی وہ خاص اطاعت ہی ساقط ہو جاتی ہے جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے: ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ.﴾''[1]

حدیث کی اس تیسری قسم (زائد علی القرآن) ہی کی بابت نبی ﷺ نے بھی اپنی امت کو تنبیہی انداز میں فرمایا تھا:

«أَلَا، إِنِّي أُوْتِيتُ الْقُرْآنَ وَمِثْلَهُ مَعَهُ»

''خبردار! یاد رکھنا، مجھے قرآن بھی عطا کیا گیا ہے اور اس کی مثل (یعنی سنت) بھی۔''[2]

اور آپ کا یہی وہ منصب ہے جو قرآن کریم کی اس آیت میں بیان فرمایا گیا ہے:

﴿وَأَنزَلْنَآ إِلَيْكَ ٱلذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ﴾

''اے پیغمبر! ہم نے آپ کی طرف قرآن اس لیے اتارا ہے تاکہ آپ لوگوں کو اس کی تشریح وتبیین کر کے بتلائیں۔''[3]

چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے اس منصب کے مطابق توضیح وتشریح کی اور اس کے اجمالات کی تفصیل بیان فرمائی، جیسے نماز کی تعداد اور رکعات، اس کے اوقات اور نماز کی وضع و ہیئت، زکاۃ کا نصاب، اس کی شرح، اس کی ادائیگی کا وقت اور دیگر تفصیلات۔ قرآن کریم کے بیان کردہ اجمالات کی یہ تفسیر وتوضیحِ نبوی امت مسلمہ میں حجت سمجھی گئی اور قرآن کریم کی طرح اسے واجب الاطاعت تسلیم کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ نماز وزکاۃ کی یہ شکلیں عہدِ نبوی سے آج تک مُسلّم ومتواتر چلی آرہی ہیں۔ اس میں کسی نے اختلاف نہیں کیا۔

---

[1] إعلام الموقعين، ج: 2، ص: 314، بتحقيق عبدالرحمن الوكيل

[2] سنن أبي داود، السنة، باب لزوم السنة، حديث: 4604 ومسند أحمد: 131/4

[3] النحل 16:44

قرآن کریم کے اجمال کی تفصیل وتفسیر جس طرح نبی ﷺ کا منصب ہے، بالکل اسی طرح عموماتِ قرآنی کی تخصیص اور اطلاقات (مطلق) کی تقیید بھی تبیین قرآنی کا ایک حصہ ہے اور قرآن کے عموم واطلاق کی آپ نے تخصیص وتقیید بھی فرمائی ہے۔ اور اسے بھی امت مسلمہ نے متفقہ طور پر قبول کیا ہے، اسے زائد علی القرآن کہہ کر رد نہیں کیا جا سکتا، جیسا کہ آج کل بعض گمراہ اذہان اس طرح کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ ذیل میں چند مثالیں ایسے عموم قرآنی کی پیش کی جاتی ہیں جن میں رسول اللہ ﷺ کی حدیث سے تخصیص کی گئی ہے۔

① قرآن کریم میں کہا گیا ہے:

﴿وَٱلسَّارِقُ وَٱلسَّارِقَةُ فَٱقْطَعُوٓا أَيْدِيَهُمَا﴾

''چور (مرد وعورت) کے ہاتھ کاٹ دو۔''[1]

﴿اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ﴾ (چوری کرنے والا مرد اور چوری کرنے والی عورت) بالکل عام ہے جس کے عموم میں ہر قسم کا چور آ جاتا ہے۔ لیکن اس عموم سے حدیث رسول نے اس چور کو خارج کر دیا جس نے رُبع دینار (1/4) سے کم کی چوری کی ہو۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لَا يُقْطَعُ السَّارِقُ إِلَّا فِي رُبْعِ دِينَارٍ فَصَاعِدًا»

''چور کے ہاتھ نہیں کاٹے جائیں گے جب تک وہ رُبع دینار، یعنی ایک چوتھائی دینار یا اس سے زیادہ کی چوری نہ کرے۔''[2]

اس حدیث نے چور کے عموم میں تخصیص کر دی کہ اس سے وہ خاص چور مراد ہے جس نے ایک خاص قدر و قیمت کی چیز چرائی ہو، نہ کہ ہر قسم کے چور کے ہاتھ کاٹ دیے جائیں گے

---

① المائدة 38:5

② سنن النسائي، قطع السارق، باب ذكر اختلاف أبي بكر بن محمد و عبدالله......، حديث: 4932

جیسا کہ آیت ''السّارق'' کے عموم کا اقتضاء ہے۔اس کے علاوہ کچھ اور تخصیصات بھی احادیث سے ثابت ہیں، نیز بعض فقہاء نے بھی بعض شرطیں عائد کر کے اس کے عموم میں مزید تخصیص کی۔مثلاً چوری محفوظ کیے ہوئے مال کی کی گئی ہو، چور مجنون نہ ہو، اضطرار کا شائبہ نہ ہو، وغیرہ وغیرہ۔اگر ایسی صورتیں ہوئیں تب بھی چور ''السّارق'' کے عموم میں شامل نہیں ہوگا۔

② قرآن کریم کی آیت ہے:

﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ﴾

''مردار اور خون تمھارے لیے حرام ہیں۔''[1]

لیکن اس عموم میں حدیث رسول ﷺ نے تخصیص کی اور مچھلی اور ٹڈی (دو مردار) اور جگر اور تلی (دو خون) حلال قرار دیے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«أُحِلَّتْ لَنَا مَيْتَتَانِ وَدَمَانِ: اَلْجَرَادُ وَالْحُوتُ وَالْكَبِدُ وَالطِّحَالُ»

حالانکہ عمومِ آیت کی رُو سے یہ چیزیں حرام قرار پاتی ہیں۔

③ قرآن کریم میں ہے:

﴿قُل لَّآ أَجِدُ فِي مَآ أُوحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلَىٰ طَاعِمٍ يَطْعَمُهُۥٓ إِلَّآ أَن يَكُونَ مَيْتَةً أَوْ دَمًا مَّسْفُوحًا أَوْ لَحْمَ خِنزِيرٍ فَإِنَّهُۥ رِجْسٌ أَوْ فِسْقًا أُهِلَّ لِغَيْرِ ٱللَّهِ بِهِۦ ۚ فَمَنِ ٱضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَإِنَّ رَبَّكَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾

اس آیت میں کلمۂ حصر (اِلّا) کے ساتھ چار محرمات کی تفصیل ہے (مردار جانور، بہتا ہوا خون، سور کا گوشت اور وہ چیز جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو۔) جس کا اقتضاء یہ ہے کہ ان محرمات مذکورہ کے علاوہ دیگر چیزیں حلال ہوں۔لیکن اس عموم میں بھی حدیثِ رسول سے تخصیص کی گئی اور ہر ذِي نَاب ''کچلی والا درندہ'' اور ذِي مِخْلَب ''پنجے سے شکار کرنے

[1] المائدہ 3:5

والا پرندہ'' بھی حرام کر دیا گیا۔ حدیث میں ہے:

«نَهٰى رَسُولُ اللهِ ﷺ عَنْ كُلِّ ذِي نَابٍ مِّنَ السِّبَاعِ وَعَنْ كُلِّ ذِي مِخْلَبٍ مِّنَ الطَّيْرِ»

(اس مفہوم کی کئی روایات کتب حدیث میں ہیں) اسی طرح حدیث رسول سے محرمات میں گدھے کا اضافہ کیا گیا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ اللهَ وَرَسُولَهُ يَنْهَيَانِكُمْ عَنْ لُحُومِ الْحُمُرِ الْأَهْلِيَّةِ»

''اللہ اور اس کا رسول تمھیں پالتو گدھے کے گوشت سے منع کرتے ہیں۔''[1]

④ اسی طرح قرآن صرف رضاعی ماں اور رضاعی بہن کی حرمت بیان کرتا ہے۔ رضاعی بیٹی کی حرمت کا اضافہ حدیثِ رسول ہی سے کیا گیا ہے۔

⑤ قرآن صرف دو بہنوں کو جمع کرنے سے منع کرتا ہے۔ خالہ اور بھانجی، پھوپھی اور بھتیجی کے جمع کرنے کی ممانعت قرآن کریم میں نہیں ہے، بلکہ ﴿وَأُحِلَّ لَكُم مَّا وَرَاءَ ذَٰلِكُمْ﴾ کے عموم سے ان کے جمع کرنے کی اباحت نکلتی ہے۔ لیکن حدیث رسول (ﷺ) ہی نے اس عموم میں یہ تخصیص کی کہ ﴿مَاوَرَاءَ ذَٰلِكُم﴾ کے حکم عموم میں خالہ بھانجی اور پھوپھی بھتیجی کو جمع کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

⑥ اسی طرح سورۃ النور کی آیت:

﴿ٱلزَّانِيَةُ وَٱلزَّانِى فَٱجْلِدُوا۟ كُلَّ وَٰحِدٍ مِّنْهُمَا مِا۟ئَةَ جَلْدَةٍ ۖ وَلَا تَأْخُذْكُم بِهِمَا رَأْفَةٌ فِى دِينِ ٱللَّهِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِٱللَّهِ وَٱلْيَوْمِ ٱلْءَاخِرِ ۖ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ ٱلْمُؤْمِنِينَ﴾

میں زانی مرد اور زانی عورت کی جو سزا، سو کوڑے بیان کی گئی ہے، یہ عام ہے جس سے

[1] صحيح البخاري، المغازي، باب غزوة خيبر، حديث: 4199

بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ زانی شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ، ہر قسم کے زانی کے لیے سو کوڑوں کی سزا ہے۔ لیکن اس آیت کے عموم میں بھی حدیث رسول نے تخصیص کر دی اور نبی ﷺ نے اپنے طرزِ عمل سے بھی اس کی وضاحت فرما دی کہ سورۃ النور میں جو زنا کی سزا بیان کی گئی ہے، وہ صرف غیر شادی شدہ زانیوں کی ہے۔ اگر زنا کار مرد یا عورت شادی شدہ ہوں گے تو ان کی سزا سو کوڑے نہیں، جو قرآن میں بیان کی گئی ہے، بلکہ رجم ......سنگساری...... ہے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، راقم کی کتاب "حدِ رجم کی شرعی حیثیت اور شبہات و مغالطات کا جائزہ")

اسی طرح اور متعدد مقامات ہیں، جہاں قرآن کے عموم کو حدیثِ رسول سے خاص اور مقید کیا گیا اور جس کو آج تک سب بالاتفاق مانتے آئے ہیں، اس لیے رسول اللہ ﷺ کا جس طرح یہ منصب ہے کہ آپ قرآن کے مجمل احکام کی تفسیر اور تفصیل بیان فرمائیں، جیسے نمازوں کی تعداد، رکعتوں کی تعداد اور دیگر مسائل نماز، زکاۃ کا نصاب اور اس کی دیگر تفصیلات، حج وعمرہ اور قربانی کے مناسک و مسائل اور دیگر اس انداز کے احکام ہیں۔ اسی طرح آپ کو یہ تشریعی مقام بھی حاصل ہے کہ آپ ایسے احکام دیں جو قرآن میں منصوص نہ ہوں جس طرح چند مثالیں ابھی بیان کی گئی ہیں۔ انھیں ظاہر قرآن کے خلاف یا زیادۃ علی القرآن یا نسخ قرآن باور کرا کے رد نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ایسے احکامِ حدیثیہ کو ظاہر قرآن کے خلاف یا قرآن پر زیادتی یا قرآن کا نسخ کہنا ہی غلط ہے۔ یہ تو رسول اللہ ﷺ کا وہ منصب ہے جس کو قرآن نے اطاعتِ رسول ﷺ کا مستقل حکم دے کر بیان فرمایا ہے: مثلاً:

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ أَطِيعُواْ ٱللَّهَ وَأَطِيعُواْ ٱلرَّسُولَ وَأُوْلِي ٱلۡأَمۡرِ مِنكُمۡۖ﴾

"اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اپنے اولوالامر کی۔"[1]

[1] النساء 4:59

اس آیت میں اللہ کی اطاعت، رسول اللہ ﷺ کی اطاعت اور اولوالامر کی اطاعت کا حکم مسلمانوں کو دیا گیا ہے۔لیکن اولوالامر کی اطاعت کے حکم کے لیے الگ ''اَطِیْعُوا'' کے الفاظ نہیں لائے گئے، البتہ ''اَطِیْعُو االلّٰہَ'' کے ساتھ ''اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ'' ضرور کہا، جس کا واضح مطلب یہی ہے کہ جس طرح اللہ کی اطاعت مستقل ہے، بالکل اسی طرح اطاعتِ رسول بھی مستقلاً ضروری ہے، تاہم اولوالامر (فقہاء وعلماء یا حاکمانِ وقت) کی اطاعت مشروط ہے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے ساتھ۔ اگر اولوالامر اطاعت رسول یا اطاعت الٰہی سے انحراف کریں تو حدیث:

«لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِی مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ»

''خالق کی نافرمانی میں، مخلوق کی اطاعت جائز نہیں۔''[1]

کے تحت ان کی اطاعت واجب نہیں رہے گی بلکہ مخالفت ضروری ہوگی۔ اور آیت مذکورہ کے دوسرے حصے:

﴿فَإِن تَنَٰزَعْتُمْ فِى شَىْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى ٱللَّهِ وَٱلرَّسُولِ﴾

''اپنے آپس کے جھگڑے اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دو۔''[2]

سے بھی یہی ثابت ہو رہا ہے، کیونکہ اگر صرف کتاب الٰہی ہی کو ماننا کافی ہوتا تو تنازعات کی صورت میں صرف کتاب الٰہی کی طرف لوٹنے کا حکم دیا جاتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے کتاب الٰہی کے ساتھ رسول کی طرف لوٹنے کو بھی ضروری قرار دیا ہے، جو رسول اللہ ﷺ کی مستقل اطاعت کے وجوب کو ثابت کر رہا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی اس مستقل اطاعت کے حکم کو قرآن کریم نے بڑا کھول کر بیان فرمایا ہے۔ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ کو بہ تکرار متعدد جگہ ذکر فرمایا۔ مثلاً سورۂ نساء کے علاوہ

[1] شرح السنة: 44/1 [2] النساء 59:4

سورۂ مائدہ: 92، سورۂ نور: 45، سورۂ محمد: 33، سورۂ تغابن: 12، نیز فرمایا:

﴿وَمَآ أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ ٱللَّهِ﴾

''ہم نے ہر رسول کو اسی لیے بھیجا کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔''[1]

﴿مَّن يُطِعِ ٱلرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ ٱللَّهَ﴾

''جس نے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کی، بلاشبہ اس نے اللہ کی اطاعت کی۔''[2]

اور فرمایا:

﴿قُلْ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ ٱللَّهَ فَٱتَّبِعُونِى﴾

''اگر تم اللہ سے محبت کرنا چاہتے ہو، تو میرا اتباع کرو۔''[3] وغیرھا من الآیات.

ان آیات سے واضح ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی حیثیت ایک مطاع اور متبوع کی ہے جس کی اطاعت واتباع اہل ایمان کے لیے ضروری ہے۔

علاوہ ازیں آپ کو فصلِ خصومات اور رفعِ تنازعات کے لیے حاکم اور حَکَم بنایا گیا ہے، جیسا کہ آیت مذکورہ بالا ﴿فَإِن تَنَٰزَعْتُمْ فِى شَىْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى ٱللَّهِ وَٱلرَّسُولِ﴾ کے علاوہ ذیل کی آیات سے بھی واضح ہے:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا۟ فِىٓ أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا۟ تَسْلِيمًا﴾

''آپ کے رب کی قسم! لوگ اس وقت تک مومن نہیں ہوں گے، جب تک وہ (اے پیغمبر!) آپ کو اپنے جھگڑوں میں اپنا حَکَم (ثالث) نہیں مانیں گے، پھر آپ کے فیصلے پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی بھی محسوس نہ کریں اور دل سے اس کو تسلیم کر لیں۔''[4]

---

① النساء 4:64 ② النساء 4:80

③ آل عمران 3:31 ④ النساء 4:65

نیز ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَن يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ﴾

''جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے کا فیصلہ کر دیں تو پھر کسی مومن مرد و عورت کو اپنے معاملے کا اختیار نہیں۔'' ①

ان آیات میں بیان کردہ نبی ﷺ کی یہ حاکمانہ حیثیت بھی آپ کی مستقل اطاعت کو ضروری قرار دیتی ہے۔ اسی طرح قرآن کریم کی آیت:

﴿وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا﴾

''رسول اللہ ﷺ تمھیں جو دیں، وہ لے لو اور جس سے وہ روک دیں، رک جاؤ۔'' ②

میں بھی آپ کا یہی منصب بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جس بات کا حکم فرمائیں وہ لے لو (یعنی اس پر عمل کرو) اور جس سے منع فرما دیں، اس سے رک جاؤ۔ گویا آپ ''آمر'' اور ''ناہی'' بھی ہوئے۔

اسی طرح قرآن کریم نے رسول اللہ ﷺ کے جو فرائض منصبی بیان فرمائے ہیں، ان میں تلاوت آیات کے ساتھ ساتھ تعلیم کتاب و حکمت کا بھی ذکر ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ﴾

''وہ پیغمبر ان پر اللہ کی آیتوں کی تلاوت کرتا ہے، ان کا تزکیہ کرتا اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔'' ③

﴿يَتْلُوا عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ﴾

① الأحزاب 36:33 ② الحشر 7:59

③ آل عمران 164:3، الجمعة 2:62

''وہ تم پر ہماری آیتیں پڑھتا ہے، تمھارا تزکیہ کرتا اور تمھیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔''[1]

ظاہر بات ہے کہ یہ تعلیم کتاب وحکمت، تلاوتِ آیات سے یکسر مختلف چیز ہے۔ اگر آپ کا مقصدِ بعثت صرف تلاوتِ آیات ہی ہوتا، اس کی تعلیم وتشریح آپ کی ذمے داری نہ ہوتی تو قرآن تعلیم کتاب وحکمت کے الگ عنوان سے اس کا ذکر کبھی نہ کرتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ تعلیم کتاب وحکمت بھی آپ کا منصب ہے اور اس سے مراد آپ کی وہی تبیین وتشریح ہے جس کی وضاحت گزشتہ صفحات میں کی گئی ہے۔

بہر حال قرآن کریم کی بیان کردہ تفصیلات سے واضح ہے کہ نبیٔ اکرم ﷺ کی حیثیت نعوذ باللہ صرف ایک ''قاصد'' اور ''چٹھی رساں'' کی نہیں ہے جس طرح کہ حدیث کی تشریعی حیثیت سے انکار کر کے باور کرایا جا رہا ہے بلکہ آپ کی حیثیت ایک مطاع ومتبوع، قرآن کے معلّم ومبیِّن اور حاکم وحکَم کی ہے، اس لیے آپ ﷺ کے جو فرامین صحیح سند سے ثابت ہیں وہ دین میں حجت اور اسی طرح واجب الاطاعت ہیں جس طرح قرآنی احکام پر عمل کرنا اہل ایمان کے لیے ضروری ہے۔

یہی وجہ ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے قرآن کریم اور احادیث رسول میں کوئی فرق نہیں کیا اور دونوں کو نہ صرف یکساں واجب الاطاعت جانا بلکہ احادیث کو قرآن ہی کا حصہ گردانا۔ چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا واقعہ مذکور ہے کہ انھوں نے ایک موقع پر فرمایا:

«لَعَنَ اللّٰهُ الْوَاشِمَاتِ وَالْمُوتَشِمَاتِ وَالْمُتَنَمِّصَاتِ وَالْمُتَفَلِّجَاتِ لِلْحُسْنِ الْمُغَيِّرَاتِ خَلْقَ اللّٰهِ»

---

[1] البقرة 151:2

''اللہ تعالیٰ گودنے والیوں اور گدوانے والیوں پر، چہرے کے بال اکھاڑنے والیوں اور حسن کے لیے آگے کے دانتوں میں کشادگی کرنے والیوں پر لعنت کرے کہ یہ اللہ کی پیدا کی ہوئی صورت میں تبدیلی کرنے والی ہیں۔''

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی اس بات کا علم قبیلہ ٔبنی اسد کی ایک عورت، ام یعقوب، کو ہوا تو وہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس آئی اور آ کر کہا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ نے اس اس قسم کی عورتوں پر لعنت بھیجی ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

«وَمَالِي لَا أَلْعَنُ مَنْ لَّعَنَ رَسُولُ اللهِ ﷺ وَمَنْ هُوَ فِي كِتَابِ اللهِ»

''آخر میں کیوں نہ ان پر لعنت کروں جن پر رسول اللہ ﷺ نے لعنت کی ہے، اور جو کتاب اللہ کے مطابق بھی ملعون ہیں۔''

اس عورت نے کہا: میں نے سارا قرآن پڑھا ہے، اس میں تو کہیں بھی (مذکورہ) عورتوں پر لعنت نہیں ہے جس طرح کہ آپ کہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: ''اگر تو قرآن کو (غور سے) پڑھتی تو اس میں ضرور یہ آیت پاتی:

﴿وَمَآ ءَاتَىٰكُمُ ٱلرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَىٰكُمْ عَنْهُ فَٱنتَهُوا۟﴾

''رسول اللہ ﷺ تمھیں جو دیں، وہ لے لو اور جس سے وہ روک دیں، رک جاؤ۔''[1]

وہ عورت کہنے لگی: ہاں، یہ آیت تو ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''تو نبی ﷺ ہی نے (مذکورہ قابل لعنت چیزوں سے) منع فرمایا ہے۔''[2]

اس حدیث میں دیکھ لیجیے، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کے فرمان کو اللہ کا فرمان اور کتاب اللہ کا حکم قرار دیا اور جب اس دور کی پڑھی لکھی خاتون کو بھی یہ نکتہ سمجھایا گیا

---

[1] الحشر 59:7

[2] صحيح البخاري، التفسير، باب وما آتاكم الرسول فخذوه، حديث :4886

تو اس نے بھی اسے بلا تأمل تسلیم کر لیا۔ اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے نزدیک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے نکلے ہوئے الفاظ قرآن ہی کی طرح وحیٔ الٰہی کا درجہ رکھتے تھے۔

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود
گرچہ از حلقومِ عبداللہ بود

خود نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے ایسے فیصلوں کو، جو قرآن میں منصوص نہیں ہیں، کتاب الٰہی کا فیصلہ قرار دیا ہے۔ جس طرح شادی شدہ زانی کی سزا......حد رجم...... ہے، جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے عموم میں تخصیص کر کے مقرر فرمائی۔ آپ نے اس حد رجم کو ''کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ'' قرار دیا:

«لَأَقْضِيَنَّ بَيْنَكُمَا بِكِتَابِ اللهِ»

''میں تم دونوں کے درمیان اللہ کی کتاب کے ساتھ فیصلہ کروں گا۔''[1] (اور پھر آپ نے یہی فیصلہ فرمایا تھا کہ شادی شدہ زانی کو رجم کیا جائے گا۔)

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے بابرکت دَور کو دیکھ لیجیے، آپ کو نمایاں طور پر یہ چیز ملے گی کہ ان کے مابین مسائل میں اختلاف ہوتا تو حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے معلوم ہوتے ہی وہ اختلاف ختم ہو جاتا اور حدیث کے آگے سب سرِ تسلیم خم کر دیتے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ کی تدفین اور آپ کی جانشینی کے مسئلے میں اختلاف ہوا، جب تک ان کی بابت حدیث کا علم نہ ہوا، اس پر گفتگو ہوتی رہی، لیکن جوں ہی حدیث پیش کی گئی، مسئلے حل ہو گئے۔ تدفین کے مسئلے میں بھی اختلاف ختم ہو گیا اور جانشینی جیسا معرکہ آرا مسئلہ بھی پلک جھپکتے حل ہو گیا۔

اس طرح متعدد قضایا اور واقعات ہیں جن میں اس امر کی صراحت موجود ہے کہ

[1] صحيح البخاري، الحدود، باب الاعتراف بالزنا، حديث :6828

حدیث رسول کو بلاتامل حجت شرعیہ سمجھا گیا اوراس کا علم ہوتے ہی بحث وتکرار کی بساط لپیٹ دی گئی۔عہد صحابہ کے بعد تابعین وتبع تابعین اور ائمہ ومحدثین کے ادوار میں بھی حدیث رسول کی یہ تشریعی حیثیت قابل تسلیم رہی بلکہ کسی دور میں بھی اہل سنت والجماعت کے اندر اس مسئلے میں اختلاف نہیں رہا۔

حدیث رسول کی یہی وہ تشریعی اہمیت تھی جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے تکوینی طور پر محدثین کا ایسا بے مثال گروہ پیدا فرمایا، جس نے حدیث رسول کی حفاظت کا ایسا سروسامان کیا کہ انسانی عقلیں ان کاوشوں کو دیکھ کر دنگ رہ گئیں اور محدثین نے حدیثِ رسول کی تہذیب وتنقیح کے لیے ایسے علوم ایجاد کیے جو مسلمانوں کے لیے سرمایۂ صد افتخار ہیں۔ اگر حدیثِ رسول کی یہ تشریعی اہمیت نہ ہوتی، جس طرح کہ آج کل باور کرایا جا رہا ہے، تو سوچنے کی بات یہ ہے کہ محدثین رحمہم اللہ کو حفاظتِ حدیث کے لیے اتنی عرق ریزی اور جگر کاوی کی پھر ضرورت کیا تھی؟

مولانا حالؔی نے کیا خوب محدثین کو منظوم ہدیۂ عقیدت پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

گروہ ایک جویا تھا علم نبی کا — لگایا پتا جس نے ہر مفتری کا
نہ چھوڑا کوئی رخنہ کذب خفی کا — کیا قافیہ تنگ ہر مدّعی کا
کیے جرح و تعدیل کے وضع قانوں
نہ چلنے دیا کوئی باطل کا افسوں

کیا فاش راوی میں جو عیب پایا — مناقب کو چھانا مثالب کو تایا
مشائخ میں جو قبح نکلا جتایا — ائمہ میں جو داغ دیکھا بتایا
طلسمِ ورع ہر مقدس کا توڑا
نہ مُلاّ کو چھوڑا نہ صوفی کو چھوڑا

قرآن کریم جس قسم کا انسانی معاشرہ تشکیل دینا چاہتا ہے، جو تہذیب وتمدن انسانوں کے لیے پسند فرماتا ہے اور جن اقدار و روایات کو فروغ دینا چاہتا ہے، اس کے بنیادی اصول اگرچہ قرآن کریم میں بیان کر دیے گئے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کی عملی تفصیلات و جزئیات سیرتِ رسول ﷺ ہی نے مہیا کی ہیں، اس لیے یہ اسوۂ رسول ......اسوۂ حسنہ...... جو احادیث کی شکل میں محفوظ و مدوّن ہے، ہر دور کے مسلمانوں کے لیے ایک بیش قیمت سرمایہ رہا ہے۔ اسی اتباعِ سنت اور پیروئ رسول کے جذبے نے مسلمانوں کو ہمیشہ الحادو زندقہ (بے دینی) سے بچایا ہے، شرک و بدعت کی گرم بازاری کے باوجود توحید وسنت کی مشعلوں کو فروزاں رکھا ہے، مادیت کے جھکڑوں میں روحانیت کے دیے جلائے رکھے ہیں اور یوں شرارِ بولہبی پر چراغِ مصطفوی غالب رہا ہے۔

آج جو لوگ سنت رسول ﷺ کی تشریعی حیثیت کو ختم کرنے پر تلے ہوئے ہیں، وہ دراصل اتباع سنت کے اسی جذبے کو نیست و نابود کرنا چاہتے ہیں، جو قرآن کریم کے بپا کردہ اسلامی معاشرے کی روح اور بنیاد ہے اور جس کے بعد انسانوں کے اس معاشرے کو، جس میں مسلمان بستے ہیں، مغربی تہذیب و تمدن میں ڈھالنا مشکل نہیں ہوگا۔ چنانچہ ہمارے معاشرے کا یہی طبقہ...... جو بدقسمتی سے ہمہ مقتدر بھی ہے...... حدیثِ رسول کی حجیت کا مخالف ہے اور صرف قرآن کریم کی پیروی کے نام پر مغربی افکاروتہذیب کو بڑی تیزی سے فروغ دے رہا ہے۔ پچھلے مختلف ادوار میں بھی اگرچہ انکارِ حدیث کا یہ فتنہ کسی نہ کسی انداز سے رہا ہے لیکن جو عروج اسے اس زمانے میں حاصل ہوا ہے، اس سے پیشتر کبھی نہ ہوا، اور جو منظم سازش اس وقت اس کے پیچھے کارفرما ہے، پہلے کبھی نہ تھی۔

اسلام کی ابتدائی دو صدیوں کے بعد معتزلہ نے بعض احادیث کا انکار کیا، لیکن اس سے ان کا مقصود اپنے گمراہ کن عقائد کا اثبات تھا، اسی طرح گزشتہ ایک ڈیڑھ صدی پہلے

نیچر پرستوں نے احادیث کی حجت شرعیہ میں مین میکھ نکالی، اس سے بھی ان کا مقصود اپنی نیچر پرستی کا اثبات اور معجزاتِ قرآنی کی من مانی تاویلات تھا۔ نیچر پرستوں کا یہی گروہ اب مستشرقین کی ''تحقیقات نادرہ'' سے متاثر، ساحرانِ مغرب کے افسوں سے مسحور اور شاہد تہذیب کی عشوہ طرازیوں سے مرعوب ہو کر ایک منظّم طریقے سے قومِ رسولِ ہاشمی کو ان کی تہذیب و معاشرت سے محروم کرنا اور اسلامی اقدار و روایات سے بیگانہ کر کے تہذیب جدید کے سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے۔ چنانچہ مغربی نومسلم فاضل علامہ محمد اسد مرحوم لکھتے ہیں:

''آج جب کہ اسلامی ممالک میں مغربی تہذیب کا اثر و نفوذ بہت بڑھ چکا ہے ہم ان لوگوں کے تعجب انگیز رویے میں، جن کو ''روشن خیال مسلمان'' کہا جاتا ہے، ایک اور سبب پاتے ہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ ایک ہی وقت میں رسول اللہ ﷺ کی سنتوں پر عمل کرنا اور زندگی میں مغربی تہذیب کو اختیار کرنا ناممکن ہے۔ پھر موجودہ مسلمان نسل اس کے لیے تیار ہے کہ ہر مغربی چیز کو عزت کی نگاہ سے دیکھے اور باہر سے آنے والے ہر تمدن کی اس لیے پرستش کرے کہ وہ باہر سے آیا ہے اور طاقتور اور چمک دار ہے۔ مادّی اعتبار سے یہ افرنگ پرستی ہی اس بات کا سب سے بڑا سبب ہے کہ آج احادیث رسول اللہ ﷺ اور سنت کا پورا نظام رواج نہیں پا رہا ہے۔ سنت نبوی ان تمام سیاسی افکار کی کھلی اور سخت تردید کرتی ہے جن پر مغربی تمدن کی عمارت کھڑی ہے، اس لیے وہ لوگ جن کی نگاہوں کو مغربی تہذیب و تمدن خیرہ کر چکا ہے، وہ اس مشکل سے اپنے کو اس طرح نکالتے ہیں کہ حدیث و سنت کا بالکلیہ یہ کہہ کر انکار کر دیں کہ سنت نبوی کا اتباع مسلمانوں پر ضروری نہیں، کیونکہ اس کی بنیاد ان احادیث پر ہے جو قابل اعتبار نہیں ہیں اور اس مختصر عدالتی فیصلے کے بعد قرآن کریم کی تعلیمات کی تحریف کرنا اور مغربی تہذیب و تمدن کی روح سے انھیں ہم آہنگ کرنا بہت آسان

ہو جاتا ہے۔"[1]

یہی علامہ محمد اسد، سنت کی اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سنت نبوی ہی وہ آہنی ڈھانچہ ہے جس پر اسلام کی عمارت کھڑی ہے۔ اگر آپ کسی عمارت کا ڈھانچہ ہٹا دیں تو کیا آپ کو اس پر تعجب ہوگا کہ عمارت اس طرح ٹوٹ جائے جس طرح مٹی کا گھروندا۔"

"یہ اعلیٰ مقام جو اسلام کو اس حیثیت سے حاصل ہے کہ وہ ایک اخلاقی، عملی، انفرادی اور اجتماعی نظام ہے، اس طریقے سے (یعنی حدیث اور اتباعِ سنت کی ضرورت کے انکار سے) ٹوٹ کر اور بکھر کر رہ جائے گا۔" (حوالۂ مذکور)

ایسے مدعیانِ اسلام کی بابت جو اتباعِ رسول سے گریزاں اور حجیت احادیث کے منکر ہیں، علامہ فرماتے ہیں:

"ایسے لوگوں کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کسی محل میں داخل ہونے کی کوشش کرتا ہے لیکن اس کنجی کو استعمال کرنا نہیں چاہتا جس کے بغیر دروازے کا کھلنا ممکن ہی نہیں۔"[2]

---

① اسلام ایٹ دی کراس روڈز، بحوالہ "اسلامی مزاج و ماحول کی تشکیل و حفاظت میں حدیث کا بنیادی کردار" ص:42، طبع ہند، لکھنؤ

② اسلام ایٹ دی کراس روڈز، بحوالہ "معارف" اعظم گڑھ، دسمبر 1934ء، ص: 421

2

حدیث کے بارے میں اہل تقلید کا عمومی طرز عمل؟
چند قابلِ غور اُمور

یہاں تک تو بحث تھی اس گروہ سے متعلق جو حدیث کی تشریعی حیثیت کا منکر ہے جس کو عام اصطلاح میں منکرِ حدیث کہا جاتا ہے۔ لیکن چونکہ بدقسمتی سے مسلمان متعدد فرقوں اور گروہوں میں بٹ گئے ہیں اور ہر فرقہ ﴿ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ﴾ "ہر گروہ اپنے معتقدات پر خوش ہے۔"[1] کے مصداق، اپنے طرزِ عمل وطرزِ فکر پر نہ صرف مطمئن ہے بلکہ اپنے ہی موقف ومسلک کو حق وصواب سمجھتا اور باقی تمام گروہوں کو غلط قرار دیتا ہے، حالانکہ محدثین اوران کے فکر وعمل کے وارث عاملین بالحدیث کے علاوہ، سب ہی گروہ حدیثِ رسول کو اُس طرح شرح صدر کے ساتھ قبول کرتے ہیں، نہ قبول کرنے کے لیے تیار ہی ہیں، جس طرح کہ اس کے مأخذِ شریعت ہونے کا تقاضا ہے، جب کہ صحیح گروہ وہی ہوسکتا ہے جو احادیثِ صحیحہ کو ذہنی تحفظ کے بغیر قبول کرے اوراس پر عمل کرے۔

---

[1] الروم 32:30

واقعہ یہ ہے کہ اگر حدیث واقعی ماٰخذِ شریعت ہے، یعنی اسے تشریعی اور تقنینی حیثیت حاصل ہے (اور بلاشبہ اسے یہ مقام اور حیثیت حاصل ہے) تو پھر ہر فرقے کا اپنے ذہنی تحفظات اور مخصوص فقہی استنباطات واجتہادات کو اہمیت دینا اور حدیث کو بہ لطائف الحیل نظر انداز کر دینا یا کسی نہ کسی خوش نما خانہ ساز اصول کے ذریعے سے اسے مسترد کر دینا، اسے کس طرح مستحسن قرار دیا جا سکتا ہے؟ یا کس طرح اسے حدیثِ رسول کو ماننا تسلیم کیا جا سکتا ہے؟

حدیثِ رسول کو ماٰخذِ شریعت ماننے کا مطلب اور تقاضا تو یہ ہے کہ جو حدیث، محدثانہ اصولِ جرح و تعدیل کی روشنی میں صحیح قرار پائے، اسے مان لیا جائے اور جو ضعیف قرار پائے، اسے نا قابل استدلال تسلیم کیا جائے۔ محدثین کا یہی اصول اور منہج ہے اور یہی منہج یا طرزِ فکر و عمل امتِ مسلمہ کے باہمی اختلافات کے ختم یا کم سے کم کرنے کا واحد طریقہ یا اس کا ضامن ہے۔ اس کے برعکس رویہ کہ صحتِ سند کے باوجود اپنی ہی یا کسی مخصوص فقہی رائے ہی کو ماننا اور ضُعفِ سند کے باوجود اسے ہی ترجیح دینا، اسے نہ حدیثِ رسول کو ماننا ہی تسلیم کیا جا سکتا ہے اور نہ اس طریقے سے فقہی اختلافات اور حزبی تعصّبات کا خاتمہ ہی ممکن ہے، جب کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان متحد ہوں، فکر و عمل کی یک جہتی ان کے اندر پیدا ہو اور دشمن کے مقابلے میں وہ بنیانِ مرصوص بن جائیں۔ اور ایسا ہونا فقہی و حزبی اختلافات و تعصّبات کی شدّت ختم ہوئے بغیر ممکن نہیں۔

غیر محدثانہ روش اور اس کے نقصانات

یہ غیر محدثانہ رویہ، جس نے امتِ واحدہ کو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا ہے، کن لوگوں نے اپنایا ہوا ہے؟ اور کیوں اپنایا ہوا ہے؟ اور اسے چھوڑنے کے لیے وہ تیار کیوں نہیں ہیں؟ ان تینوں سوالوں کا جواب واضح ہے:

① یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے محدثین کی روش سے انحراف کیا ہے جو خالص اور ٹھیٹھ اسلام کی

آئینہ دار اور [مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِيْ] کی مصداق تھی اور ہے۔

② انھوں نے ایسا کیوں کیا؟ اس لیے کیا کہ انھوں نے اپنے آپ کو کسی ایک فقہی مذہب سے وابستہ کرلیا جس کا اللہ نے اور اللہ کے رسول نے قطعاً حکم نہیں دیا۔ اتباع کے بجائے، انھوں نے ابتداع (اپنی طرف سے شریعت سازی) کا اور اطاعت کے بجائے تقلید کا راستہ اختیار کیا۔

اتباع کیا ہے اور ابتداع کیا؟ اتباع کا مطلب ہے، اللہ کے رسول کے پیچھے لگنا، کیونکہ صرف وہی اللہ کا نمائندہ ہے، اللہ نے اسی کے اتباع کا حکم دیا ہے۔ اور ابتداع یہ ہے کہ اس اتباعِ رسول سے تجاوز کر کے اپنی طرف سے کسی چیز کو واجب قرار دینا جیسے کسی نہ کسی امام کی تقلید یا خود ساختہ فقہ کی پابندی کو لازم سمجھنا اور لازم قرار دینا۔ امتیوں کو تو اتباع کا حکم ہے نہ کہ ابتداع کا۔ اور اطاعت کا مطلب بھی صرف ﴿مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ (اللہ کی نازل کردہ باتوں) کا ماننا ہے۔ ہم اللہ کے رسول کی اطاعت و اتباع بھی اِسی لیے کرتے ہیں کہ اللہ نے اپنی اطاعت کے ساتھ اپنے رسول کی بھی غیر مشروط اطاعت کا حکم دیا ہے۔ غیر مشروط اطاعت کا یہ حق صرف اللہ کے رسول ﷺ کا ہے، مخلوق میں سے کسی اور کو یہ حق حاصل نہیں۔ اسی لیے اللہ نے اپنے رسول کی اطاعت کو اپنی اطاعت قرار دیا ہے:

﴿مَّن يُطِعِ ٱلرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ ٱللَّهَ﴾

''جس نے رسول اللہ کی اطاعت کی بلاشبہ اس نے اللہ کی اطاعت کی۔''[1]

یہ بلند مقام اللہ کے رسول کے علاوہ کسی اور کو حاصل ہے؟ نہیں، یقیناً نہیں۔ اور اللہ نے اپنے رسول کو یہ بلند مقام اس لیے دیا ہے کہ وہ اللہ کا نمائندہ ہے۔ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ اس کی براہِ راست حفاظت و نگرانی بھی فرماتا ہے اور اسے راہِ راست (صراطِ مستقیم) سے اِدھر اُدھر

① النساء 80:4

نہیں ہونے دیتا۔ (دیکھیے: سورۃ الإسراء 74,73:17 و نحوھا من الآیات) یہ مقامِ عصمت بھی اللہ کے رسول کے علاوہ کسی کو حاصل نہیں۔ ائمہ کی تقلید کو لازم قرار دینے والے کیا یہ دعوی کر سکتے ہیں کہ ان کے امام کو یہ مقامِ عصمت حاصل ہے؟ اس کی رائے میں غلطی کا امکان نہیں ہے؟ اس کا ہر قول اور ہر اجتہاد صحیح ہے؟ یقیناً کوئی شخص یہ دعوی نہیں کر سکتا۔ اگر ایسا ہے اور یقیناً ایسا ہی ہے، تو پھر ہر مسئلے میں کسی ایک ہی شخص کی بات کو بلا دلیل ماننے کو لازم قرار دینا، (جسے اصطلاحاً اور عرفاً تقلید کہا جاتا ہے) کیا یہ اس کے لیے غیر مشروط اطاعت کا حق تسلیم کروانا اور اسے مقامِ عصمت پر فائز کرنا نہیں ہے؟

③ یہاں سے اس تیسرے سوال کا جواب، کہ یہ حضرات یہ روش چھوڑنے کے لیے کیوں تیار نہیں؟ سامنے آ جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ گو یہ اپنی زبانوں سے عصمتِ ائمہ کا اظہار یا دعوی نہیں کرتے لیکن عملاً صورت حال یہی ہے کہ انھوں نے ائمۂ کرام کو ائمۂ معصومین کا درجہ دے رکھا ہے۔ اپنے امام کی ہر بات کو ﴿مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ کی طرح بلکہ اس سے بھی بڑھ کر تسلیم کرتے ہیں اور اپنی خود ساختہ فقہوں کے مقابلے میں حدیث رسول سے اعراض و گریز، ان کا وطیرہ اور شیوۂ گفتار ہے۔

ان کا یہ طرزِ عمل و فکر محدثین کے منہج و مسلک سے یکسر مختلف ہے، شیوۂ مسلمانی کے برعکس ہے اور امت کی فکری وحدت و یک جہتی کو سب سے زیادہ نقصان پہنچانے والا ہے۔

ان حضرات کے بارے میں ہماری بات کوئی مفروضہ یا واہمہ نہیں، ایک حقیقتِ واقعہ ہے، شک و شبہ سے بالا ہے اور روزِ روشن کی طرح واضح ہے جس کا مشاہدہ صدیوں سے ہو رہا ہے اور ہر دور کے اہلِ علم نے اس کا اظہار کیا ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ جن کی بابت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اہلِ تقلید سے کوئی مخاصمت رکھتے تھے، بلکہ پاک و ہند کے وابستگانِ تقلید تو اپنے آپ کو مسند ولی اللہ ہی کے

جانشین اور فکر ولی اللہ ہی کے وارث سمجھتے ہیں، یہ فرماتے ہیں:

وَتَرَى الْعَامَّةَ، سِيَمَا الْيَوْمَ، فِي كُلِّ قُطْرٍ يَّتَقَيَّدُونَ بِمَذْهَبٍ مِّنْ مَّذَاهِبِ الْمُتَقَدِّمِينَ يَرَوْنَ خُرُوجَ الْإِنْسَانِ مِنْ مَّذْهَبِ مَنْ قَلَّدَهُ وَلَوْ فِي مَسْئَلَةٍ كَالْخُرُوجِ مِنَ الْمِلَّةِ، كَأَنَّهُ نَبِيٌّ بُعِثَ إِلَيْهِ وَافْتُرِضَتْ طَاعَتُهُ عَلَيْهِ، وَكَانَ أَوَائِلُ الْأُمَّةِ قَبْلَ الْمِائَةِ الرَّابِعَةِ غَيْرَ مُتَقَيِّدِينَ بِمَذْهَبٍ وَّاحِدٍ

''تم عام لوگوں کو دیکھو گے، خاص طور پر آج کل، ہر علاقے ہی میں، جنھوں نے اپنے آپ کو کسی نہ کسی (تقلیدی) مذہب سے وابستہ کر رکھا ہے کہ وہ اپنے امام کے مذہب سے نکلنے کو، چاہے کسی ایک ہی مسئلے میں ہو، ایسے سمجھتے ہیں جیسے وہ ملتِ اسلام ہی سے نکل گیا، گویا وہ (امام) ایسا نبی ہے جو اس کی طرف منجانب اللہ بھیجا گیا ہے اور اس کی اطاعت اس پر فرض قرار دی گئی ہے، حالانکہ چوتھی صدی ہجری سے پہلے کے لوگ کسی ایک مذہب سے وابستہ نہیں تھے۔''[1]

اور یہی شاہ ولی اللہ حجۃ اللہ البالغہ میں امام عزالدین عبدالسلام کا قول نقل فرماتے ہیں:

وَمِنَ الْعَجَبِ الْعَجِيبِ أَنَّ الْفُقَهَاءَ الْمُقَلِّدِينَ يَقِفُ أَحَدُهُمْ عَلٰى ضُعْفِ مَأْخَذِ إِمَامِهِ بِحَيْثُ لَا يَجِدُ لِضُعْفِهِ مَدْفَعًا، وَّهُوَ مَعَ ذٰلِكَ يُقَلِّدُهُ فِيهِ وَيَتْرُكُ مَنْ شَهِدَ الْكِتَابُ وَالسُّنَّةُ وَالْأَقْيِسَةُ الصَّحِيحَةُ لِمَذْهَبِهِمْ جُمُودًا عَلٰى تَقْلِيدِ إِمَامِهِ، بَلْ يَتَحَيَّلُ لِدَفْعِ ظَاهِرِ الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ وَيَتَأَوَّلُهَا بِالتَّأْوِيلَاتِ الْبَعِيدَةِ الْبَاطِلَةِ

[1] التفهيمات الإلٰهية:206/1 تفهیم نمبر 66، مطبوعہ شاہ ولی اللہ اکادمی، حیدر آباد سندھ، 1970ء

نَضَالًا عَنْ مُّقَلَّدِهِ، وَقَالَ لَمْ يَزَلِ النَّاسُ يَسْأَلُونَ مَنِ اتَّفَقَ مِنَ الْعُلَمَاءِ مِنْ غَيْرِ تَقْيِيدٍ لِّمَذْهَبٍ وَّلَا إِنْكَارٍ عَلٰى أَحَدٍ مِّنَ السَّائِلِينَ، إِلٰى أَنْ ظَهَرَتْ هٰذِهِ الْمَذَاهِبُ وَمُتَعَصِّبُوهَا مِنَ الْمُقَلِّدِينَ، فَإِنَّ أَحَدَهُمْ يَتَّبِعُ إِمَامَهُ مَعَ بُعْدِ مَذْهَبِهِ عَنِ الْأَدِلَّةِ مُقَلِّدًا لَّهُ فِيمَا قَالَ كَأَنَّهُ نَبِيٌّ أُرْسِلَ، وَهٰذَا نَأْيٌ عَنِ الْحَقِّ وَبُعْدٌ عَنِ الصَّوَابِ، لَا يَرْضٰى بِهِ أَحَدٌ مِّنْ أُوْلِي الْأَلْبَابِ

''مقلدین فقہاء کی یہ بات نہایت ہی عجیب ہے کہ انھیں صاف طور پر نظر آ جاتا ہے کہ ان کے امام کے قول کا ماٗ خذ اوراس کی سند نہایت بودی اور کمزور ہے اورایسی کوئی دلیل بھی موجود نہیں جو اس کے ضعف اور کمزوری کو رفع کر دے، پھر بھی وہ اس (امام) کے قول پر از راہ تقلید جمے رہتے ہیں اور جس قول کی قرآن وحدیث کی ناطق دلیلیں شاہد ہیں اور قیاس صحیح اس کی تائید میں ہے، اس کو وہ قبول نہیں کرتے بلکہ الٹا ان دلائلِ صحیحہ اور قرآن وحدیث کے شواہد کو لطائف الحِیَل سے دفع کرنا چاہتے ہیں اور بعید از عقل و درایت باطل تاویلیں گھڑتے ہیں۔ اور اس تمام تگ و دو کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جس کو انھوں نے امام تسلیم کیا ہے، اس کے قول کو غلط نہ کہنا پڑے۔'' امام عزالدین نے مزید کہا: ''مسلمانوں کا ہمیشہ اس پر عمل رہا ہے کہ جب بھی کسی کو کوئی مسئلہ یا حکم شرعی پوچھنا ہوتا، تو وہ کسی عالم سے پوچھ لیتا، قطع نظر اس سے کہ وہ کس مذہب کا عالم ہے، اس پر کوئی انکار بھی نہیں کرتا تھا۔ یہاں تک کہ ان مذاہبِ اربعہ کو فروغ حاصل ہوا اور ان کے پیروکاروں نے اندھی تقلید کو اپنا شیوہ بنا لیا۔ چنانچہ وہ اس صورت میں بھی اپنے مقرر کردہ امام کی تقلید کرتے ہیں جب کہ اس کا قول اور مذہب دلیل اور برہان سے کوسوں دور ہوں۔ وہ اُس کی اِس حد تک تقلید کرتے ہیں

گویا وہ نبی مُرسل ہے۔ یہ طرزِ عمل حق وصواب سے بہت دُور ہے جو کسی عقل مند آدمی کے لیے پسندیدہ نہیں ہوسکتا۔"[1]

شاہ صاحب رحمہ اللہ تقلید حرام کی مثالیں بیان کرتے ہوئے، ایک مثال یہ بھی بیان کرتے ہیں:

"ایسے عامی کے لیے بھی تقلید حرام ہے جو فقہاء میں سے کسی ایک فقیہ (امام) کی تقلید کرتا اور اعتقاد رکھتا ہے کہ اس سے غلطی کا صدور ناممکن ہے اور اس نے جو کچھ کہا ہے، وہ یقیناً درست ہے۔ اور اپنے دل میں یہ عقیدہ بھی رکھتا ہے کہ وہ اس کی تقلید نہیں چھوڑے گا اگرچہ اس کے امام کے قول کے خلاف دلیل بھی مل جائے۔ یہ تقلید کی وہی قسم ہے جس کی بابت ترمذی میں حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے، جس میں انھوں نے فرمایا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ آیت پڑھتے ہوئے سُنا:

﴿اتَّخَذُوٓا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّن دُونِ ٱللَّهِ﴾

"یہود ونصاری نے اپنے علماء اور درویشوں کو اللہ کے سوا اپنا رب بنا لیا۔"[2]

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "وہ اپنے علماء کی پوجا پاٹ نہیں کرتے تھے، ان کو اپنا رب بنانے کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے ان کو یہ حیثیت دے دی کہ جب وہ ان کے لیے کسی چیز کو حلال قرار دے دیتے، وہ اس کو حلال سمجھتے اور جس چیز کو ان کے لیے حرام کر دیتے، اس کو وہ حرام سمجھتے۔" (حجۃ اللہ البالغہ، صفحہ مذکور)

کیا آج کل کے اہل تقلید کا رویہ بالکل ایسا ہی نہیں ہے؟ اور ان کے علماء عوام کو یہی باور نہیں کراتے کہ تمھیں حدیث سے کوئی غرض نہیں بلکہ اس کو دیکھنا بھی تمھارے لیے گمراہی ہے،

---

① حُجَّةُ اللّٰه البالغة: 155/1، مطبوعه المكتبة السلفيه، لاهور، 1975ء

② التوبة 31:9

تمھارے لیے بس تمھارے امام کا قول ہی کافی ہے؟۔

ایک اور مقام پر شاہ صاحب رحمہ اللہ طالبان علم سے خطاب کرتے ہوئے اور انھیں صرف کتاب وسنت کا علم حاصل کرنے کی تلقین کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

خُضْتُمْ كُلَّ الْخَوْضِ فِي اسْتِحْسَانَاتِ الْفُقَهَاءِ مِنْ قَبْلِكُمْ وَتَفْرِيعَاتِهِمْ، أَمَا تَعْرِفُونَ أَنَّ الْحُكْمَ مَا حَكَمَهُ اللهُ وَرَسُولُهُ، وَرُبَّ إِنْسَانٍ مِّنْكُمْ يَبْلُغُهُ حَدِيثٌ مِّنْ أَحَادِيثِ نَبِيِّكُمْ، فَلَا يَعْمَلُ بِهِ وَيَقُولُ: إِنَّمَا عَمَلِي عَلَى مَذْهَبِ فُلَانٍ، لَا عَلَى الْحَدِيثِ، ثُمَّ احْتَالَ بِأَنَّ فَهْمَ الْحَدِيثِ وَالْقَضَاءَ بِهِ مِنْ شَأْنِ الْكَمَلِ الْمَهَرَةِ، وَإِنَّ أَئِمَّةً لَّمْ يَكُونُوا مِمَّنْ يَّخْفٰى عَلَيْهِمْ هٰذَا الْحَدِيثُ، فَمَا تَرَكُوهُ إِلَّا لِوَجْهٍ ظَهَرَ لَهُمْ فِي الدِّينِ مِنْ نَّسْخٍ أَوْ مَرْجُوحِيَةٍ، اِعْلَمُوا أَنَّهُ لَيْسَ هٰذَا مِنَ الدِّينِ فِي شَيْءٍ، إِنْ آمَنْتُمْ بِنَبِيِّكُمْ فَاتَّبِعُوهُ خَالَفَ مَذْهَبًا أَوْ وَافَقَهُ، كَانَ مَرْضِيُّ الْحَقِّ أَنْ تَشْتَغِلُوا بِكِتَابِ اللهِ وَسُنَّةِ رَسُولِهِ ابْتِدَاءً فَإِنْ سَهُلَ عَلَيْكُمُ الْأَخْذُ بِهَا فَبِهَا وَنِعِمَتْ، وَإِنْ قَصُرَتْ أَفْهَامُكُمْ فَاسْتَعِينُوا بِرَأْيِ مَنْ مَّضٰى مِنَ الْعُلَمَاءِ مَا تَرَوْهُ أَحَقَّ وَأَصْرَحَ وَأَوْفَقَ بِالسُّنَّةِ

”تم اپنے سے ماقبل فقہاء کے استحسانات وتفریعات پر خوب بحث وتکرار اور غور وخوض کرتے ہو۔ کیا تم نہیں جانتے کہ حکم تو وہی ہے جو اللہ نے اور اس کے رسول نے دیا ہے۔ اور تم میں سے بہت انسان ایسے ہیں کہ ان کو تمھارے پیغمبر کی کوئی حدیث پہنچتی ہے، تو وہ اس پر عمل نہیں کرتا اور کہتا ہے کہ میرا عمل تو فلاں (امام) کے مذہب پر ہے

نہ کہ حدیث پر۔ پھر یہ بہانہ پیش کرتا ہے کہ حدیث کا سمجھنا اور اس کی روشنی میں کسی بات کا فیصلہ کرنا تو کامل اور ماہر لوگوں کا کام ہے (نہ کہ مجھ جیسوں کا۔) اور (یہ بہانہ بھی کرتا ہے کہ) یہ حدیث آخر اماموں کے سامنے بھی تو رہی ہوگی، جب انھوں نے اس کو چھوڑ دیا، تو ان کے نزدیک کوئی وجہ ہوگی، یا تو ان کے نزدیک یہ منسوخ ہوگی یا مرجوح۔ اچھی طرح جان لو! اس رویے کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر تم اپنے نبی پر ایمان لائے ہو تو اس کی پیروی بھی کرو، چاہے اس کی بات (تمھارے) مذہب کے خلاف ہو یا موافق۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی یہی ہے کہ تم سب سے پہلے اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کے ساتھ اشتغال رکھو (ان کو اپنے فکر و نظر اور اخذ و استفادہ کا محور بناؤ۔) اگر ان سے آسانی کے ساتھ اخذ مسائل کر لو، تو فبہا اور اگر اس میں کچھ دقت پیش آئے تو ماقبل کے علماء سے مدد حاصل کرو (ان کی شروحات اور فقہ الحدیث پر مبنی کتابوں سے استفادہ کرو) اور ان کی اس رائے کو قبول کرو جو زیادہ صحیح، صریح اور سنت کے زیادہ موافق ہے۔"[1]

شاہ صاحب رحمہ اللہ اسی تفہیم میں اس سے کچھ پہلے لکھتے ہیں:

وَأَشْهَدُ لِلّٰهِ بِاللّٰهِ أَنَّهُ كُفْرٌ بِاللّٰهِ أَنْ يُعْتَقَدَ فِي رَجُلٍ مِّنَ الْأُمَّةِ مِمَّنْ يُّخْطِئُ وَيُصِيبُ أَنَّ اللّٰهَ كَتَبَ عَلَيَّ اتِّبَاعَهُ حَتْمًا وَّأَنَّ الْوَاجِبَ عَلَيَّ هُوَ الَّذِي يُوجِبُهُ هٰذَا الرَّجُلُ عَلَيَّ، وَلٰكِنَّ الشَّرِيعَةَ الْحَقَّةَ قَدْ ثَبَتَ قَبْلَ هٰذَا الرَّجُلِ بِزَمَانٍ قَدْ وَعَاهَا الْعُلَمَاءُ وَأَدَّاهَا الرُّوَاةُ وَحَكَمَ بِهَا الْفُقَهَاءُ، وَإِنَّمَا اتَّفَقَ النَّاسُ عَلٰى تَقْلِيدِ الْعُلَمَاءِ عَلٰى مَعْنًى أَنَّهُمْ رُوَاةُ الشَّرِيعَةِ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ وَأَنَّهُمْ

[1] التفهيمات الالهية: 283/1، تفهيم 69

عَلِمُوا مَا لَمْ نَعْلَمْ، وَأَنَّهُمُ اشْتَغَلُوا بِالْعِلْمِ مَالَمْ نَشْتَغِلْ فَلِذٰلِكَ قَلَّدُوا الْعُلَمَاءَ، فَلَوْ أَنَّ حَدِيثًا صَحَّ، وَشَهِدَ بِصِحَّتِهِ الْمُحَدِّثُونَ، وَعَمِلَ بِهِ طَوَائِفُ، فَظَهَرَ فِيهِ الْأَمْرُ ثُمَّ لَمْ يَعْمَلْ بِهِ هُوَ، لِأَنَّ مَتْبُوعَهُ لَمْ يَقُلْ بِهِ فَهٰذَا هُوَ الضَّلَالُ الْبَعِيدِ

''میں اللہ کی قسم کھا کر گواہی دیتا ہوں کہ امت کے کسی آدمی کے بارے میں، جس کی رائے میں خطا اور صواب دونوں باتوں کا امکان ہے، یہ عقیدہ رکھنا کہ اللہ نے اس کی پیروی کرنا میرے لیے لازمی کر دی ہے اور مجھ پر وہ چیز واجب ہے جو یہ شخص مجھ پر واجب کر دے، کفر ہے۔ شریعتِ حقّہ تو اس آدمی (امام) سے بہت پہلے ہی ثابت ہو چکی ہے جسے علماء نے محفوظ رکھا ہے۔ راویوں نے اسے آگے لوگوں تک پہنچایا ہے اور فقہاء نے اس کے ساتھ فیصلے کیے ہیں۔ البتہ لوگوں نے علماء کی تقلید (پیروی) پر صرف اس لیے اتفاق کیا ہے کہ وہ نبی ﷺ سے شریعت کے بیان کرنے والے ہیں۔ ان کے پاس جو علم ہے اس سے ہم نا آشنا ہیں اور وہ علم میں مشغول رہتے ہیں، جب کہ ہماری مشغولیات دوسری قسم کی ہیں، اس لیے لوگوں نے علماء کی تقلید (پیروی) کی ہے، تاہم اگر کوئی حدیث صحیح آ جائے، جس کی صحت کی گواہی محدثین نے دی ہو، اور مختلف گروہوں نے اس پر عمل بھی کیا ہو، جس کی وجہ سے معاملے میں کوئی اشتباہ نہ رہا ہو لیکن پھر بھی وہ شخص اس (حدیث) پر عمل نہ کرے، اس لیے کہ اس کا امام اس کا قائل نہیں ہے، تو یہ بہت ہی دُور کی (بڑی) گمراہی ہے۔''[1]

اہلِ تقلید کے اِس رویے کے بارے میں اور بھی متعدد علماء نے اسی قسم کے خیالات کا اظہار فرمایا ہے جن کا اظہار مذکورہ سطور میں کیا گیا ہے ان سب کی تفصیل یہاں ضروری نہیں

[1] التفهيمات الالٰهية:279/1، مطبوعه: 1970ء

ہے۔اہلِ علم ان سے باخبر ہیں تاہم یہاں مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم کے بھی دو اقتباسات پیش کرنے مناسب معلوم ہوتے ہیں، ان میں انھوں نے اہل تقلید کے اس رویے کا اعتراف بھی کیا ہے اور اس پر سخت افسوس کا اظہار بھی۔ مولانا تھانوی اپنے ایک مکتوب میں، جو انھوں نے مولانا رشید احمد گنگوہی مرحوم کے نام تحریر کیا، لکھتے ہیں:

''اکثر مقلدین عوام بلکہ خواص اس قدر جامد ہوتے ہیں کہ اگر قول مجتہد کے خلاف کوئی آیت یا حدیث کان میں پڑتی ہے (تو) اُن کے قلب میں انشراح وانبساط نہیں رہتا بلکہ اول استنکار قلب میں پیدا ہوتا ہے پھر تاویل کی فکر ہوتی ہے خواہ کتنی ہی بعید ہو اور خواہ دوسری دلیل قوی اُس کے معارض ہو بلکہ مجتہد کی دلیل اُس مسئلہ میں بہ جز قیاس کے کچھ بھی نہ ہو بلکہ خود اپنے دل میں اُس تاویل کی وقعت نہ ہو مگر نصرت مذہب کے لیے تاویل ضروری سمجھتے ہیں۔ دل یہ نہیں مانتا کہ قول مجتہد کو چھوڑ کر حدیث صحیح صریح پر عمل کر لیں۔ بعض سنن مختلف فیہا مثلاً آمین بالجہر وغیرہ پر حرب وضرب کی نوبت آ جاتی ہے۔ اور قرون ثلثہ میں اس کا شیوع بھی نہ ہوا تھا بلکہ کَيْفَمَا اتَّفَق جس سے چاہا مسئلہ دریافت کر لیا اگرچہ اس امر پر اجماع نقل کیا گیا ہے کہ مذاہب اربعہ کو چھوڑ کر مذہب خامس مستحدث کرنا جائز نہیں، یعنی جو مسئلہ چاروں مذہبوں کے خلاف ہو اُس پر عمل جائز نہیں کہ حق دائر ومنحصران چار میں ہے مگر اس پر بھی کوئی دلیل نہیں کیونکہ اہلِ ظاہر ہر زمانہ میں رہے اور یہ بھی نہیں کہ سب اہل ہوئی ہوں، وہ اس اتفاق سے علیحدہ رہے۔ دوسرے اگر اجماع ثابت بھی ہو جاوے مگر تقلید شخصی پر تو کبھی اجماع بھی نہیں ہوا۔''[1]

اِسی مکتوب میں اس سے قبل مولانا تھانوی نے یہ لکھا ہے، یہ بھی بڑا قابل عبرت ہے،

[1] تذکرۃ الرشید: 131/1، ادارہ اسلامیات، لاہور 1986ء

لکھتے ہیں:

''تقلید شخصی کہ عوام میں شائع ہو رہی ہے اور وہ اس کو علماً اور عملاً اس قدر ضروری سمجھتے ہیں کہ تارکِ تقلید سے، گو کہ اس کے تمام عقائد موافق کتاب وسنت کے ہوں، اس قدر بغض ونفرت رکھتے ہیں کہ تارکین صلاۃ فساق وفجار سے بھی نہیں رکھتے اور خواص کا عمل وفتویٰ وجوب اس کا مؤید ہے۔'' (حوالۂ مذکور وصفحۂ مذکور)

مولانا تھانوی ایک اور مقام پر تقلید وعدم تقلید کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''بعض مقلدین نے اپنے ائمہ کو معصوم عن الخطا ومصیب وجوباً ومفروض الاطاعت تصور کر کے عزم بالجزم کیا، کہ خواہ کیسی ہی حدیث صحیح مخالف قول امام کے ہو اور مستند قول امام کا بہ جز قیاس امر دیگر نہ ہو، پھر بھی بہت سی علل وخلل حدیث میں پیدا کر کے، یا اس کی تاویل بعید کر کے حدیث کو رد کریں گے اور قول امام کو نہ چھوڑیں گے۔ ایسی تقلید حرام اور مصداق قولہ تعالیٰ ﴿ اتَّخَذُوٓا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَٰنَهُمْ أَرْبَابًا مِّن دُونِ ٱللَّهِ ﴾ اور خلاف وصیت ائمۂ مرحومین کے ہے۔''[1]

اِس قسم کی تقلید جامد کو، جس کا تذکرہ مذکورہ اقتباسات میں کیا گیا ہے، مولانا محمود الحسن نے بھی کفر سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ وہ ''ایضاح الادلہ'' میں تقلید کے اثبات پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تمام نصوص ردِّ تقلید سے اُس تقلید کا بُطلان ثابت ہوتا ہے کہ جو تقلید بہ مقابلہ تقلید احکامِ خدا اور رسولِ خدا ہو اور ان کے اتباع کو اتباع احکامِ الٰہی پر ترجیح دے۔ سو پہلے کہہ چکا ہوں کہ اس تقلید کے مردود وممنوع، بلکہ کفر ہونے میں کس کو کلام ہے؟''[2]

---

[1] إمداد الفتاوىٰ: 297/5، مكتبه دار العلوم كراچی، طبع جديد2004ء

[2] اِیضاح الادلہ ص: 113، مطبوعہ ایچ، ایم سعید کمپنی کراچی، 1999ء، اور اضافہ شدہ مع حاشیۂ جدیدہ ایڈیشن کا صفحہ: 223، مطبوعہ قدیمی کتب خانہ کراچی

اقتداء واتباع تو ناگزیر ہے لیکن زیر بحث تقلید اس سے قطعاً مختلف ہے

اِن اقتباسات سے یہ تو واضح ہے کہ کسی امام کی اس انداز سے تقلید کرنا کہ صحیح اور واضح حدیث کے سامنے آ جانے کے بعد بھی قولِ امام ہی کو ترجیح دینا اور اس کے مقابلے میں صحیح حدیث کو چھوڑ دینا ممنوع، حرام، ﴿اتَّخَذُوٓا أَحۡبَارَهُمۡ وَرُهۡبَٰنَهُمۡ أَرۡبَابًا مِّن دُونِ ٱللَّهِ﴾ کا مصداق اور بقول صاحبِ ''ایضاح الادلّہ'' کفر ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ مروّجہ تقلید اس سے مختلف ہے یا وہ اِسی ذیل میں آتی ہے جس کی مذمت وحرمت پر سب کا اتفاق ہے؟

اہل تقلید کا دعویٰ ہے کہ ہمارا وہی طریقہ ہے جو عہدِ صحابہ وتابعین میں تھا، یعنی جس شخص کو مسئلے کا علم نہ ہوتا تھا، وہ کسی بھی صاحب علم سے دریافت کر لیتا تھا۔ تین سو سال سے زیادہ عرصے تک یہی طریقہ رائج تھا، یہ طریقہ ظاہر بات ہے، بالکل صحیح بھی ہے اور ناگزیر بھی۔ کیونکہ ہر شخص تو ماہر شریعت نہیں ہو سکتا، لہٰذا ضروری ہے کہ بے خبر شخص، باخبر شخص سے پوچھے۔ بے علم عالم سے دریافت کرے اور کم علم والا اپنے سے زیادہ علم رکھنے والے کی طرف رجوع کرے۔ یہ معاملہ شریعت ہی کے ساتھ خاص نہیں ہے، ہر علم وفن کا معاملہ یہی ہے۔ شرعی مسائل واحکام معلوم کرنے کا بھی یہی طریقہ ہے اور عوام کے لیے اس کے بغیر چارہ نہیں ہے۔ لیکن اس میں دو باتیں ضروری ہیں اور صحابہ وتابعین کے زمانے میں ان دونوں باتوں کا پورا اہتمام موجود تھا۔

① پوچھنے والا صرف اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام پوچھتا تھا، اِس کے علاوہ اس کے ذہن میں کچھ اور نہیں ہوتا تھا۔

② بتانے والا بھی اپنے علم کی حد تک اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام ہی بتلاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اگر اسے اس مسئلے کا علم نہ ہوتا، تو وہ سائل کو کسی اور کی طرف بھیج دیتا، یا

اپنی سمجھ کے مطابق بتلاتا، پھر اسے اس کے مطابق حدیث مل جاتی تو خوش ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے منہ سے صحیح بات نکلوائی۔ اور اگر اسے اس کے خلاف حدیث مل جاتی، تو فوراً اپنی بات سے رجوع کر لیتا۔

خیر القرون کا یہی طریقہ شاہ ولی اللہ نے پوری تفصیل سے "حجۃ اللہ البالغہ" اور اپنی بعض دیگر کتابوں میں بیان کیا ہے حتی کہ مولانا اشرف علی تھانوی نے بھی "امداد الفتاویٰ" (ج:5، ص:294-300) میں اس کی بابت یہی تفصیل بیان کی ہے۔

اِس طریقے کو اصطلاحی طور پر تقلید نہیں کہا جاتا، کیونکہ تقلید کی تعریف اس پر صادق نہیں آتی۔ تقلید تو کسی کی بات کو بغیر دلیل کے ماننے کا نام ہے۔ علاوہ ازیں اس میں یہ بات بھی داخل ہے کہ ماننے والا (مقلِد) مُقلَّد (امام وغیرہ) سے دلیل کا مطالبہ نہیں کر سکتا، جب کہ ایک عام شخص جب کسی عالم سے کوئی مسئلہ پوچھتا ہے یا کسی مفتی سے فتویٰ طلب کرتا ہے تو اس کے پیش نظر اللہ اور اس کے رسول کا حکم معلوم کرنا ہوتا ہے، اِسی لیے وہ اس کی دلیل بھی، بہ وقت ضرورت، پوچھ لیتا ہے اور پوچھ سکتا ہے، یا اس کی بتلائی ہوئی دلیل سے اس کی تشفی نہیں ہوتی تو وہ کسی اور عالم یا مفتی سے پوچھ لیتا ہے۔ اِس طریقے میں عالم اور مفتی بھی قرآن و حدیث کی روشنی ہی میں مسئلے کی وضاحت کرتا ہے، کسی مخصوص فقہ کو سامنے نہیں رکھتا۔

یہ طریقہ اقتدا اور اتباع کہلاتا ہے کیونکہ اِس میں اصل جذبہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی پیروی کرنے کا ہوتا ہے۔ چوتھی صدی ہجری سے پہلے تک تمام مسلمان عوام و خواص، جاہل و عالم اِسی طریقے پر کاربند تھے۔ لیکن جب چوتھی صدی میں فقہی مذاہب کو فروغ حاصل ہوا، اور محدثین اور اُن کے ہم مسلک لوگوں کے علاوہ دوسروں نے اپنے آپ کو کسی نہ کسی مذہب سے وابستہ کر لیا تو مذکورہ طریقہ صرف محدثین اور ان کی روش پر چلنے والوں تک محدود ہو گیا اور دوسروں کے ہاں ایک مخصوص فقہ کی پابندی ضروری ہو گئی اور ان کے عوام و خواص

سب ہی نے صحابہ و تابعین کے طریقے کو چھوڑ دیا اور تقلید کو واجب قرار دے دیا۔ جس کا مطلب ہی یہ تھا اور ہے کہ اب براہِ راست قرآن و حدیث سے اخذِ مسائل کی ضرورت نہیں حتی کہ علماء و مفتیان بھی اپنے عوام کو قرآن و حدیث کے مطابق مسائل بتلانے کے پابند نہیں۔ وہ پابند ہیں تو صرف اس بات کے کہ ان کی مخصوص فقہ میں کیا درج ہے، اس کی روشنی میں یہ جائز ہے یا ناجائز؟ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے عوام کو احادیث کی کتابوں کے مطالعے سے روکتے ہیں اور کئی مفتی حضرات تو اس حد تک جسارت کرتے ہیں کہ اسے گمراہی قرار دیتے ہیں۔

افتراقِ امت کا باعث تقلید حرام ہے، نہ کہ علماء کی پیروی

افتراقِ امت کے المیے کا اصل نقطۂ آغاز بھی یہی ہے ورنہ قرآن و حدیث کے فہم و تعبیر کا یا اجتہاد و استنباط کا کچھ نہ کچھ اختلاف تو صحابہ و تابعین میں بھی تھا۔ یہ اختلاف محدثین کے درمیان بھی تھا اور ان کے مسلک و منہج کے پیروکار عاملین بالحدیث کے درمیان بھی ہے۔ لیکن یہ اختلاف فہم و تعبیر کا ہے یا استنباط و اجتہاد کا یا پھر اس کا مبنی حدیث کی صحت و ضعف کا اختلاف ہے، جیسے صحابہ میں اختلاف کی ایک وجہ کسی حدیث سے بے خبری یا اس کے نسخ یا عدم نسخ سے لاعلمی بھی تھی۔ یہ اختلاف افتراقِ اُمت کا باعث نہیں، اِسی لیے صحابہ و تابعین کا دور، اختلافات کے باوجود، فرقہ بندیوں سے پاک تھا۔

بنا بریں اہل تقلید کا یہ دعویٰ کہ ہماری تقلید وہ نہیں جس کو ممنوع اور حرام کہا گیا ہے بلکہ ہمارا طریقہ تو وہی ہے جو صحابہ و تابعین کا تھا، کس طرح درست قرار دیا جا سکتا ہے، جب کہ دونوں طریقے فکر و منہج سے لے کر مقصد و مدعا تک ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہیں؟ اور ان کے درمیان اتنی وسیع خلیج حائل ہے کہ جس کا پاٹنا بظاہر نہایت مشکل ہے۔ ﴿ إِلَّآ أَن يَشَآءَ ٱللَّهُ ﴾ اس دعوے کے رد میں یا دونوں نقطہ ہائے نظر کے فرق و اختلاف پر بہت کچھ کہا جا سکتا ہے، اور تقلید کے وہ نمونے بھی پیش کیے جا سکتے ہیں جن میں فقہ کے مقابلے میں صحیح احادیث کو

نظر انداز کیا گیا ہے یا ان میں دور از کار تاویلیں کی گئی ہیں۔ لیکن ہمارا مقصد چونکہ اختلافات کی خلیج کو، جو پہلے ہی ناقابل عبور بنی ہوئی ہے، وسیع کرنا نہیں ہے، ﴿ وَاللَّهُ عَلَىٰ مَا نَقُولُ وَكِيلٌ ﴾ اِس لیے اس پر گفتگو کرنے کے بجائے ہم ﴿الدين النصيحة﴾ (دین خیر خواہی کا نام ہے) کے طور پر اختلافات کی شدت کو ختم کرنے کے لیے چند گزارشات پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ علماء سے تو ہمیں یہ امید بہت کم ہے کہ وہ سنجیدگی سے اِن پر غور فرمائیں گے، تاہم عوام سے ہم یہ استدعا ضرور کریں گے کہ وہ ان پہلوؤں پر غور کریں اور اس کی روشنی میں فیصلہ کریں کہ وہ اب تک جس راہ پر چلتے آئے ہیں، وہ واقعی صحیح ہے؟ یا اس کا رُخ بدلنے کی ضرورت ہے؟ حدیث کی کتاب کا مطالعہ کرتے وقت اگر عوام میں یہ احساس اُجاگر ہو جائے اور غور وفکر کا داعیہ اور جذبہ پیدا ہو جائے اور اس کے ساتھ ساتھ صراطِ مستقیم کی اللہ تعالیٰ سے دعا اور اس کی طلبِ صادق بھی ان کے اندر ہو، تو یقیناً اللہ تعالیٰ مدد فرمائے گا۔

بقول علامہ اقبال ؎

ہم تو مائل بہ کرم ہیں، کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے، راہروِ منزل ہی نہیں

قابلِ غور وفکر پہلو

① اللہ کا نازل کردہ دین ایک ہی ہے۔ اور وہ اسلام اور صرف اسلام ہے۔

﴿إِنَّ ٱلدِّينَ عِندَ ٱللَّهِ ٱلْإِسْلَٰمُ﴾ [1]

﴿وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ ٱلْإِسْلَٰمِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِى ٱلْءَاخِرَةِ مِنَ ٱلْخَٰسِرِينَ﴾ [2]

اس دین کو اللہ تعالیٰ نے یا اللہ کے رسول نے ''مذاہب'' میں تقسیم نہیں فرمایا، بلکہ اس ایک

① آل عمران 19:3 ② آل عمران 85:3

دین ہی کو مل کر مضبوطی سے تھامنے کا حکم دیا اور جُدا جُدا ہونے سے منع فرمایا ہے:

﴿وَٱعْتَصِمُوا۟ بِحَبْلِ ٱللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا۟ ۚ وَٱذْكُرُوا۟ نِعْمَتَ ٱللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنتُمْ أَعْدَآءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُم بِنِعْمَتِهِۦٓ إِخْوَٰنًا وَكُنتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ ٱلنَّارِ فَأَنقَذَكُم مِّنْهَا ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ ٱللَّهُ لَكُمْ ءَايَٰتِهِۦ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ﴾ ①

اور اپنے رسول کے ذریعے سے بھی اعلان کروایا۔

﴿وَأَنَّ هَٰذَا صِرَٰطِى مُسْتَقِيمًا فَٱتَّبِعُوهُ ۖ وَلَا تَتَّبِعُوا۟ ٱلسُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَن سَبِيلِهِۦ ۚ ذَٰلِكُمْ وَصَّىٰكُم بِهِۦ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾

''یہ میرا سیدھا راستہ ہے، تم اِسی کی پیروی کرو، اور کئی راستوں کے پیچھے مت لگو، وہ تمھیں اس سیدھے راستے سے پلٹا دیں گے۔'' ②

② قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے متعدد مقامات پر تفرُّق سے روکا ہے، جس کا مطلب فرقوں اور گروہوں میں بٹ جانا ہے اور فقہی مذاہب میں منقسم ہو جانا بھی اس سے خارج نہیں ہے۔ علاوہ ازیں نبی ﷺ نے بھی ایک ہی راستے پر چلنے کی تلقین فرمائی ہے اور دوسرے تمام راستوں کو غلط قرار دیا ہے۔ اِس اعتبار سے حق کا راستہ ایک ہی ہو سکتا ہے نہ کہ متعدد۔ عقل و نقل کے اعتبار سے متعدد راستے بہ یک وقت کس طرح ''حق'' ہو سکتے ہیں۔

قرآن تو کہتا ہے:

﴿فَمَاذَا بَعْدَ ٱلْحَقِّ إِلَّا ٱلضَّلَٰلُ ۖ﴾

''حق ایک ہی ہے، باقی سب گمراہی۔'' ③

③ یہ دین اسلام یا صراطِ مستقیم کیا ہے؟ اور کہاں ہے؟ یہ قرآنِ مجید اور نبی ﷺ کی احادیث

① آل عمران 103:3 ② الأنعام 154:6 ③ یونس 32:10

کا نام ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

«تَرَكْتُ فِيكُمْ أَمْرَيْنِ لَنْ تَضِلُّوا مَا تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا ، كِتَابَ اللهِ وَسُنَّةَ نَبِيِّهِ»

''میں تمھارے اندر دو چیزیں چھوڑ چلا ہوں، تم جب تک اِن دونوں کو تھامے رہو گے، ہرگز گمراہ نہیں ہو گے، ایک اللہ کی کتاب اور دوسری اس کے نبی کی سنت۔''[1]

④ یہ دین، سابقہ دینوں کی طرح غیر محفوظ نہیں رہا۔ چونکہ قیامت تک آنے والے انسانوں کے لیے یہی دین راہ نجات ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا بھی ذمہ لیا اور فرمایا:

﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا ٱلذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُۥ لَحَٰفِظُونَ﴾

''ہم ہی نے اس ''الذکر'' کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔''[2]

﴿الذکر﴾ سے مراد قرآن مجید ہے، جو محفوظ ہے، اِس میں کسی قسم کا تغیر نہیں ہوا ہے اور نہ آئندہ ہی ہو سکے گا۔ اور چونکہ حدیثِ رسول کے بغیر اس کو سمجھنا اور اس پر عمل کرنا ممکن نہیں تھا، اس لیے اس کی حفاظت کے مفہوم میں حدیث کی حفاظت بھی شامل ہے۔ چنانچہ حدیث کی حفاظت کے لیے اللہ تعالیٰ نے محدثین کا گروہ پیدا فرمایا جس نے بے مثال کاوش و محنت سے حدیث کی حفاظت کا عظیم الشان کام سرانجام دیا، اِس لیے اس دین کا مأخذ صرف اور صرف قرآنِ کریم اور احادیث صحیحہ ہیں اور ان کو سمجھنے کے لیے کسی بھی فقہی کتاب کی ضرورت نہیں، البتہ صحابۂ کرام کا منہج اور ان کی تعبیرات کی پابندی ضروری ہے۔

⑤ ائمہ کرام میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ ان کی بات حرفِ آخر ہے بلکہ اس کے

---

① موطأ إمام مالك، كتاب القدر، حديث : 3

② الحجر 9:15

برعکس انھوں نے یہ کہا ہے کہ ان سے بھی غلطی ہو سکتی ہے۔ اِسی لیے انھوں نے اس امر کی بھی تاکید کی ہے کہ ان کے قول کے مقابلے میں صحیح حدیث آ جائے، تو ہماری بات کو چھوڑ دینا اور حدیث پر عمل کرنا۔ علاوہ ازیں خود ان کا بھی کئی باتوں میں رجوع ثابت ہے۔ اور بعض مسائل میں ان کے شاگردوں کی بھی یہ صراحت موجود ہے کہ یہ حدیث ہمارے استاد اور امام کے سامنے نہیں تھی، اس لیے انھوں نے اس کے برعکس رائے اختیار کی اگر انھیں یہ حدیث مل جاتی، تو وہ یقیناً اپنی رائے سے رجوع کر لیتے۔ ائمہ کے دور میں احادیث کی جمع و تدوین اور ان کی جانچ پرکھ کا وہ کام نہیں ہوا تھا جو کتب ستہ اور دیگر کتابوں کے مؤلفین نے کیا، اس لیے ان کے سامنے، بطور خاص اِمام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے سامنے احادیث کے یہ مجموعے نہیں تھے، اس لیے وہ تو اپنی غلطی پر معذور بلکہ ماجور ہی ہوں گے۔ لیکن احادیث صحیحہ کے مجموعے مرتب و مُدَوَّن ہو جانے کے بعد، حدیث کے مقابلے میں، کسی فقہی رائے پر اصرار کرنے اور مختلف انداز سے حدیثوں کو مسترد کرنے کا کیا جواز ہے؟

⑥ اِن ائمہ کے شاگردانِ رشید نے بہت سے مسائل میں اپنے امام اور استاذ سے اختلاف کیا ہے۔ قاضی ابو یوسف اور امام محمد دونوں اِمام ابوحنیفہ کے سب سے اہم شاگرد ہیں۔ انھوں نے اپنے اِمام سے فروع ہی میں نہیں، اصول میں بھی اختلاف کیا ہے۔ اور اختلاف بھی چند ایک مسائل ہی میں نہیں بلکہ دو تہائی ($\frac{2}{3}$) مسائل میں کیا ہے۔ اگر وہ اِمام صاحب سے اتنے اختلافات کے باوجود مقلد کے مقلد ہی ہیں، تو بعد کے لوگ بھی اگر دلائل کی بنیاد پر ایسا کریں گے، تو اسے کون غیر معقول یا اِمام کے مذہب سے خروج قرار دے سکتا ہے؟

اِس اختلاف کی اور بھی کئی مثالیں ہیں۔ اِن میں ایک اور نہایت نمایاں مثال مولانا

عبدالحی لکھنوی حنفی کی ہے۔ انھوں نے فقہ کے مقابلے میں احادیث کو ترجیح دیتے ہوئے بیسیوں مسائل میں محدثین کے مسلک کو راجح قرار دے کر انھیں اختیار کیا ہے جس کی تفصیل ہمارے فاضل دوست مولانا ارشاد الحق اثری حفظہ اللہ (فیصل آباد) کی تالیف ''مسلک احناف اور مولانا عبدالحی لکھنوی'' میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ بلکہ مولانا اشرف علی تھانوی اور ان کے ہم عصر علمائے دیوبند نے بھی زوجۂ مفقود الخبر اور بعض دیگر صورتوں میں فقہ حنفی کو چھوڑ کر فقہ مالکی کی رائے کو اختیار کیا ہے۔[1]

بلکہ اِس کتاب کے نئے ایڈیشن میں حرفِ آغاز کے عنوان سے مولانا تقی عثمانی صاحب کا دیباچہ ہے، اس میں ان کا بھی یہ اعتراف موجود ہے:

''ایسی خواتین جنھوں نے نکاح کے وقت تفویض طلاق کے طریقے کو اختیار نہ کیا ہو، اگر بعد میں کسی شدید مجبوری کے تحت شوہر سے گلو خلاصی حاصل کرنا چاہیں، مثلاً شوہر اتنا ظالم ہو کہ نہ نفقہ دیتا ہو نہ آباد کرتا ہو۔ یا وہ پاگل ہو جائے یا مفقود الخبر ہو جائے یا نامرد ہو اور از خود طلاق یا خلع پر آمادہ نہ ہو، تو اصل حنفی مسلک میں ایسی عورتوں کے لیے شدید مشکلات ہیں، خاص طور پر اُن مقامات پر جہاں شریعت کے مطابق فیصلے کرنے والا کوئی قاضی موجود نہ ہو، ایسی عورتوں کے لیے اصل حنفی مسلک میں شوہر سے رہائی کی کوئی صورت نہیں ہے...... حضرت حکیم الامت (مولانا تھانوی) قدس سرہ نے ایسے بیشتر مسائل میں مالکی مذہب کے مطابق فتوی دیا ہے''[2]

اس میں یہ بھی صراحت ہے کہ (متحدہ) ہندوستان کے علماء نے بھی مولانا تھانوی کی تصدیق وتائید فرمائی۔

---

1. تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، الحیلۃ الناجزۃ، تالیف مولانا اشرف علی تھانوی
2. الحیلۃ الناجزۃ، ص: 9-10 دارالإشاعت، کراچی

مثال کے طور پر زوجۂ مفقود الخبر کے متعلق فقہ مالکی کے مطابق یہ موقف اختیار کیا گیا ہے کہ وہ عدالتی فیصلے کے بعد چار سال انتظار کرے اور اس کے بعد چار مہینے 10 دن عدت گزار کے دوسری جگہ نکاح کر لے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ مرافعہ (عدالتی چارہ جوئی) کے بعد مزید انتظار کی صورت میں اگر عورت اندیشۂ ابتلا ظاہر کرے اور اس نے ایک عرصۂ دراز تک مفقود کا انتظار کرنے کے بعد مجبور ہو کر اس حالت میں درخواست دی ہو جب کہ صبر سے عاجز آ گئی ہو، تو اس صورت میں اس کی بھی گنجائش ہے کہ مذہب مالکیہ کے موافق چار سال کی میعاد میں تخفیف کر دی جائے، کیونکہ جب عورت کے ابتلا کا شدید اندیشہ ہو تو ان (مالکیوں) کے نزدیک کم از کم ایک سال صبر کے بعد تفریق جائز ہے۔ [1]

ایک اور حنفی عالم ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن (سابق چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل) نے اس سے بھی کم مدت کے اندر، یعنی فی الفور عدالت کو نکاح فسخ کر کے دوسری جگہ شادی کرنے کی اجازت دی ہے۔ چنانچہ وہ ایک سال کے قول کو (چار سال کے مقابلے میں) موجودہ زمانے کے لحاظ سے ترجیح دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مگر لازم ہے کہ مزید ایک سال انتظار کا حکم اس صورت میں دیا جائے گا جب کہ عورت کے پاس ایک سال کے نفقے کا انتظام موجود ہو۔ بصورت دیگر عدالت، بعد ثبوت مفقود الخبری، بوجہ مفقود الخبریٔ شوہر و عدم موجودگیٔ نفقہ، فی الفور نکاح فسخ کرنے کی مجاز ہوگی۔'' [2]

ایک مجلس کی تین طلاقوں کا مسئلہ بھی اہل حدیث و احناف کے مابین ایک اہم مسئلہ ہے۔ لیکن اِس میں بھی متعدد علمائے احناف نے اہل حدیث کے نقطۂ نظر کو اپنایا ہے اور دوسروں کو بھی اس کے اپنانے کی تلقین کی ہے جیسے مولانا سعید احمد اکبر آبادی مدیر ''برھان'' دہلی، مولانا

---

[1] الحیلۃ الناجزۃ، ص: 71

[2] مجموعۂ قوانین اسلام: 701/2

عبدالحلیم قاسمی (بانی جامعہ حنفیہ گلبرگ، لاہور) مولانا حسین علی واں بھچراں، پیر کرم شاہ ازہری وغیرھم ہیں۔ اور ایسے بھی متعدد علماء ہیں جنھوں نے بہ وقت ضرورت (یعنی ناگزیر حالات میں) مجلس واحد کی تین طلاقوں کو ایک طلاق شمار کر کے رجوع کرنے کا فتوی دیا ہے جیسے مفتی کفایت اللہ دہلوی اور مولانا عبدالحی لکھنوی وغیرہ۔ (دیکھیے ''کفایت المفتی'' اور ''فتاوی مولانا عبدالحی لکھنوی۔'') اور ایسے بھی ہیں جو خود تو فتوی دینے سے گریز کرتے ہیں لیکن بعض خاص حالات میں وہ اپنے خاص مریدوں یا متعلقین کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ کسی اہل حدیث عالم سے فتوی حاصل کر کے رجوع کر لیں۔ بعض اور مسائل میں بھی اِس قسم کی مثالیں موجود ہیں جیسے مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی مثال سطورِ بالا میں گزری۔ یہ مولانا انور شاہ کشمیری کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں، اس کے باوجود انھوں نے فقہ حنفی کے بہت سے مسائل کو چھوڑ کر دوسری رائے اختیار کی۔ علاوہ ازیں انھوں نے حدیث کے بارے میں بعض علمائے احناف کی روش پر بھی سخت تنقید کی اور اسے محدثین کا استخفاف، ان کی سعی و کاوش پر پانی پھیرنے اور منکرینِ حدیث کی ہم نوائی سے تعبیر کیا۔ (اس کی تفصیل راقم کے مضمون ''مولانا سعید احمد اکبر آبادی اور ان کا فقہی توسُّع'' میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے، جو ان کی وفات کے بعد لکھا گیا تھا اور اُس وقت ''الاعتصام''، ''میثاق'' اور ''محدث'' بنارس (بھارت) وغیرہ میں شائع ہوا تھا۔

اِس تقلید کو آخر کیا کہا جائے؟

جب اس قسم کی مثالیں موجود ہیں جو یقیناً مستحسن بھی ہیں اور وقت کی ضرورت بھی اور سب سے بڑھ کر نصوصِ شریعت کا اقتضاء بھی۔ تو پھر اِس کے برعکس فقہی جمود کی یہ مثالیں ناقابل یقین لگتی ہیں جو بعض اکابر کی طرف سے سامنے آئی ہیں۔ لیکن چونکہ وہ ان کی کتابوں میں موجود ہیں، اس لیے انھیں جھٹلانا بھی ممکن نہیں ہے جیسے مثال کے طور پر مولانا محمود الحسن صاحب، جن کو شیخ الھند کہا جاتا ہے، فرماتے ہیں

اَلْحَقُّ وَالْإِنْصَافُ أَنَّ التَّرْجِيحَ لِلشَّافِعِيِّ فِي هٰذِهِ الْمَسْئَلَةِ وَنَحْنُ مُقَلِّدُونَ يَجِبُ عَلَيْنَا تَقْلِيدُ إِمَامِنَا أَبِي حَنِيفَةَ

''حق وانصاف کی بات یہی ہے کہ (احادیث ونصوص کے اعتبار سے اس مسئلہ خیارِ مجلس) میں اِمام شافعی کی رائے کو ترجیح حاصل ہے۔لیکن ہم مُقلِّد ہیں، ہم پر اپنے امام ابوحنیفہ کی تقلید ہی واجب ہے۔''[1]

اِسی ذیل میں بعض وہ تبدیلیاں بھی آتی ہیں جو نصوص حدیث میں محض اس لیے کی گئی ہیں کہ ان کے معمول بہ مسائل کا اثبات ہو سکے جیسے مسند حُمیدی میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے جو اثبات رفع الیدین میں واضح ہے،لیکن الفاظ کے معمولی ردّ و بدل سے اسے عدم رفع الیدین کی دلیل بنا دیا گیا ہے۔اسی طرح ''مُصنَّف ابن أبي شَيْبه'' کی ایک روایت اور سنن ابوداود کی ایک روایت میں کیا گیا۔ان کی تفصیل بہ وقت ضرورت پیش کی جاسکتی ہے۔

حتی کہ تقلیدی جمود کا یہ نقشہ بھی سامنے آیا کہ اثباتِ تقلید کے جوش میں قرآن مجید کی ایک آیت میں ﴿وإلی أولی الأمر منکم﴾ کا اضافہ کر دیا گیا۔اسے کتابت کی غلطی اس لیے نہیں سمجھا جا سکتا کہ استدلال کی ساری بنیاد ہی اس اضافی ٹکڑے پر ہے۔[2] ایک اور صاحب نے قرآن مجید کی ایک آیت میں لفظی ومعنوی تصرف کر کے عدم رفع الیدین کو ''ثابت'' کر دکھایا ہے (ملاحظہ ہو ''تحقیق مسئلہ رفع الیدین، از ابو معاویہ صفدر جالندھری، ابوحنیفہ اکیڈمی، فقیر والی، ضلع بہاول نگر، تاریخِ اشاعت درج نہیں۔)

آج اُس فقہی توسُّع کی ضرورت ہے جس کی بعض مثالیں مولانا عبدالحی لکھنوی وغیرہ کے طرزِ عمل میں ملتی ہیں،جس میں نصوصِ شریعت کی بالا دستی قائم رہتی ہے،نہ کہ اس فقہی جمود کی

---

[1] التقرير للترمذي، ص:49، مكتبة رحمانيه، لاهور

[2] ایضاح الأدلّة، ص: 216 ,215

جس کی کچھ مثالیں عرض کی گئی ہیں جس کے عدم جواز میں کوئی اختلاف نہیں، بلکہ ان کی اپنی صراحت کے مطابق اس میں کفر تک کا اندیشہ پایا جاتا ہے۔ علمائے اسلام اور مُفتیانِ دینِ متین کو کون سی راہ اختیار کرنی چاہیے یا ان کا منصبِ عظیم کس راہ کو اپنانے کا تقاضا کرتا ہے؟ اس کی وضاحت یا فیصلہ کوئی مشکل امر نہیں۔

﴿فَأَيُّ ٱلْفَرِيقَيْنِ أَحَقُّ بِٱلْأَمْنِ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ﴾

''دونوں فریقوں میں سے کون امن وسلامتی کا زیادہ مستحق ہے، اگر تم علم رکھتے ہو؟''[1]

امن وسلامتی کی راہ وہی ہے جس کی نشاندہی ہم نے بالکل آغاز میں کی تھی جوامتِ مسلمہ کی وحدت کی ضامن بھی ہے اور فقہی اختلافات وحزبی تعصّبات کے خاتمے یا کم از کم اس کی شدت کو کم کرنے کا واحد ذریعہ بھی۔ اور یہ محدثین کی راہ ہے کسی ذہنی تحفظ کے بغیر عمل بالحدیث کی راہ ہے فقہی جمود کے بجائے فقہی توسُّع کی راہ ہے اور ہر صورت میں نصوصِ شریعت کی برتری کو ماننے اور قائم رکھنے کی راہ ہے۔ اور اس کے خطوط حسب ذیل ہیں:

محدثین کا مسلک ومنہج اور اہل تقلید کا رویہ

❶ حدیث کی صحت وضعف کی تحقیق میں سند کو بنیادی اہمیت حاصل ہے:

لَو لَا الْإِسْنَادُ لَقَالَ مَنْ شَاءَ مَا شَاءَ

''سند کو تسلیم نہ کیا جائے، تو پھر ہر شخص جو چاہے، کہہ سکتا ہے۔''[2]

سند ہی غیر صحیح روایات کو جانچنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

اِس بنیاد سے غیر صحیح روایات کو صحیح قرار دینے کے تمام چور دروازے بند ہو جاتے ہیں

① الأنعام 81:6

① مقدمہ صحیح مسلم، ص: 11

جیسے مثلاً کہا جاتا ہے:

- فلاں اِمام نے جو بات کہی ہے، آخراُن کے سامنے بھی تو کوئی حدیث ہوگی؟
- یا اُن کے دَور تک اس حدیث کی سند میں کوئی راوی ضعیف، متروک اور کذاب نہیں ہوگا۔
- یا حدیث کی صحت وضعف ایک اجتہادی امر ہے۔ اس لیے ایک مجتہد نے جس حدیث سے استدلال کیا ہے، چاہے وہ ضعیف بلکہ موضوع ہی ہو، اس کا استدلال صحیح ہے۔ کسی دوسرے مجتہد کو اس کی بات کو رد کرنے کا حق نہیں ہے۔
- یا روایت تو ضعیف یا موضوع (من گھڑت، یعنی بے سند) ہے، لیکن اسے ''تَلَقِّي بِالْقَبُول'' کا درجہ حاصل ہے۔ جیسے ''أَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ نُورِي'' یا ''لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْأَفْلَاكَ'' جیسی بے سند بنائی ہوئی حدیثیں ہیں۔ یہ دونوں من گھڑت روایات بریلوی حضرات ہی نہیں، علمائے دیو بند بھی اپنی کتابوں میں لکھتے اور اپنے وعظ وتقریر میں بیان کرتے ہیں۔
- یا حسن ظن کی بنیاد پر مرسل روایات کو صحیح تسلیم کرنا۔
- یا ''درایت'' کے خلاف ہونے کا دعویٰ کر کے روایت کو ردّ کر دینا۔
- یا اپنے خود ساختہ اصولوں کی روشنی میں صحیح احادیث کو ردّ کر دینا، جس پر شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز رحمہما اللہ نے بھی احتجاج کیا ہے۔
- یا (بہ زعم خویش) یہ دعویٰ کر کے کہ فلاں حدیث قرآن کے معارض ہے، حدیث کو ردّ کر دینا۔ (جب کہ کوئی صحیح حدیث قرآن کے معارض نہیں)
- یا حدیثِ آحاد کو نظر انداز کرنا۔
- یا غیر فقیہ راوی (صحابی) کی روایت قیاس کے خلاف ہوگی، تو نامقبول ہوگی۔

اور اس قسم کے طریقے یا اصول، جن کے ذریعے سے صحیح حدیث کو بلا تأمل ردّ کر دیا جاتا

ہے اور ضعیف، مرسل حتی کہ موضوع حدیث تک کو قبول کر لیا جاتا ہے۔ یہ محدثین کے مسلک و منہج کے خلاف یا بہ الفاظ دیگر، ثابت شدہ نصوص حدیث کو مسترد کرنے یا غیر ثابت شدہ بات کو شریعت باور کرانے کی مذموم سعی ہے، جس کے ہوتے ہوئے کبھی نصوصِ شریعت کی بالادستی قائم نہیں ہوسکتی اور نہ اختلافات کا خاتمہ ہی ممکن ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان چور دروازوں کا کوئی تعلق امام ابوحنیفہ سے نہیں ہے۔ یہ سب بعد کے لوگوں کی ایجاد ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک اصول بھی اِمام ابوحنیفہ سے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ گویا محدثین کی روش کو اپنانا اِمام صاحب کی تقلید کے منافی نہیں ہے۔

❷ محدثین کا دوسرا وصف، اَمانت و دیانت کا اہتمام ہے۔ انھوں نے احادیث کی جمع و تدوین میں بھی کمال دیانت کا مظاہرہ کیا ہے اور جرح و تعدیل کے اصولوں کو استعمال کر کے احادیث کا رتبہ متعین کرنے میں بھی انھوں نے کسی ذہنی تحفظ کا مظاہرہ کیا ہے، نہ کسی حزبی و فقہی تعصب کا۔

اہل تقلید میں اِس کی بھی کمی ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں دی جاسکتی ہیں، لیکن یہاں ہم صرف چار مثالیں پیش کریں گے، دو علمائے دیوبند کی، تیسری بریلوی حضرات کی یہ دونوں ہی اِمام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مقلد کہلاتے ہیں۔ چوتھی مثال، دونوں میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے۔

پہلی مثال: خواتین نماز کس طرح پڑھیں؟ یعنی وہ رکوع سجدہ کس طرح کریں؟ ہاتھ کہاں باندھیں؟ رفع الیدین کس طرح کریں؟ عورتوں کی بابت کسی بھی صحیح حدیث میں ان امور کی وضاحت نہیں ملتی، اِس لیے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان:

«صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي»

''تم اس طرح نماز پڑھو جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔''[1]

---

[1] صحيح البخاري، الأذان، باب الأذان للمسافرين إذا كانوا جماعة ......، حديث: 231

کے عموم میں شامل ہوں گی اور مذکورہ سارے کام مردوں ہی کی طرح سرانجام دیں گی۔ لیکن علمائے احناف کہتے ہیں کہ مرد اور عورت کی نماز میں فرق ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ عورت ہاتھ سینے پر باندھے (جب کہ مرد ناف کے نیچے) عورت ہاتھ باندھتے، یعنی تکبیر تحریمہ کے وقت اپنے ہاتھ کندھوں تک اُٹھائے (جب کہ مرد کانوں کی لو کو ہاتھ لگائے) عورت سجدہ بالکل سمٹ کر اور زمین سے چمٹ کر کرے، جب کہ سجدے میں مردوں کی کُہنیاں اور بازو زمین سے اُٹھے ہونے چاہییں۔ اِسی طرح کچھ اور فرق بھی بتلائے جاتے ہیں (ہم نے اختصار کی خاطر موٹی موٹی باتیں بیان کی ہیں۔) ''خواتین کا طریقۂ نماز'' تالیف مولانا عبدالرؤف سکھروی ہمارے سامنے ہے، اِس میں ان فروق کو بیان کرنے کیلئے احادیث کے نام سے کئی احادیث بیان کی گئی ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی ایک حدیث بھی صحیح نہیں ہے اور ستم ظریفی کی انتہا ہے یا امانت و دیانت کے فقدان کا یہ حال ہے کہ ان بیان کردہ احادیث میں ''السنن الكبرى للبيهقى'' کی دو روایات بھی ہیں۔ جن کو درج کر کے امام بیہقی نے لکھا ہے (لا يحتج بأمثالهما) ''یہ روایات اتنی ضعیف ہیں کہ ان جیسی روایات سے استدلال نہیں کیا جا سکتا۔'' لیکن مذکورہ کتاب کے مؤلف نے ان الفاظ کو تو نقل نہیں کیا، البتہ دونوں ناقابل استدلال روایات کو اپنے استدلال میں پیش کیا ہے۔ یہی حال دیگر روایات کا ہے جو انھوں نے پیش کی ہیں۔ فإلى الله المشتكي۔ (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، راقم کی کتاب ''کیا عورتوں کا طریقۂ نماز مردوں سے مختلف ہے؟'')

دوسری مثال: علمائے احناف کے چوٹی کے عالم مولانا احمد علی سہارنپوری کی ہے جن کا حاشیۂ صحیح بخاری متداول ہے۔ انھوں نے حدیث إِذَا أُقِيمَتِ الصَّلَاةُ فَلَا صَلَاةَ إِلَّا الْمَكْتُوبَةَ (صحیح مسلم، حدیث : 710) جسے امام بخاری نے ترجمۃ الباب (الصلاة، باب:38) میں ذکر کیا ہے۔ اس کے حاشیے میں سنن بیہقی کے حوالے سے یہی حدیث نقل کی

ہے، اس میں إِلَّا رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ کے الفاظ کا اضافہ ہے۔ یعنی ''فرض نماز کی تکبیر ہو جانے کے بعد کوئی نماز نہیں، البتہ فجر کی دو رکعتیں (سنتیں) پڑھنا جائز ہے۔'' حالانکہ امام بیہقی رحمہ اللہ نے اس اضافے کی بابت صراحت کی ہے کہ ''یہ اضافہ (البتہ فجر کی دو سنتیں پڑھنا جائز ہے) بے اصل ہے'' وهذه الزيادة لا أصل لها. اور لکھتے ہیں کہ اس اضافے کو بیان کرنے والے حجاج بن نصیر اور عباد بن کثیر ہیں اور یہ دونوں راوی ضعیف ہیں۔ (السنن الكبرى، للبيهقي: 483/4 طبع قديم) اس کے باوجود ایک صحیح حدیث کو ردّ کرنے اور اپنے خلافِ حدیث رواج کو صحیح باور کرانے کے لیے صحیح بخاری کے فاضل محشی نے اس بے اصل اضافے کو حدیث رسول کہہ کر بیان کیا ہے۔[1]

یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ صحیح بخاری کا یہ حاشیہ آج سے تقریباً سوا سو سال قبل جب چھپ کر پہلی مرتبہ منظر عام پر آیا تھا تو شیخ الکل میاں نذیر حسین محدث دہلوی رحمہ اللہ نے ایک مکتوب کے ذریعے سے اس کوتاہی یا بددیانتی کی طرف توجہ دلائی تھی، لیکن اس کی اصلاح نہیں کی گئی۔ اور صحیح بخاری کے عربی حاشیے میں یہ بے اصل حدیث، حدیث رسول کے نام سے اب تک موجود ہے۔ میاں نذیر حسین محدث دہلوی کا یہ مکتوب جو عربی میں ہے، کتاب ''أعلام أهل العصر'' (تالیف مولانا شمس الحق ڈیانوی) میں موجود ہے۔ فإلى الله المشتكي. غالباً اسی بے بنیاد روایت کی بنیاد پر عام مسجدوں میں فجر کی جماعت کے دوران میں لوگ بے دھڑک سنتیں پڑھ رہے ہوتے ہیں اور حدیثِ رسول (نماز کی تکبیر ہو جانے کے بعد فرض نماز کے علاوہ کوئی نماز نہیں۔) (صحيح مسلم) کی خلاف ورزی کی جاتی اور ﴿ وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنصِتُوا ...... ﴾ (الأعراف 204:7) ''جب قرآن پڑھا جا رہا ہو، تو تم کان لگا کر سنو اور خاموش رہو۔'' کا ذرا لحاظ نہیں کیا جاتا۔ اور علماء یہ منظر روزانہ اپنی

[1] صحيح البخاري: 197/1، طبع نور محمد

آنکھوں سے دیکھتے ہیں، لیکن فقہی جمود نے ان کی آنکھوں پر پٹیاں باندھی ہیں۔

تیسری مثال: بریلوی حضرات کے ہاں رواج ہے کہ نمازِ جنازہ کے فوراً بعد میت کے اِردگرد کھڑے ہو کر سب ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگتے ہیں، اِس کو وہ بہت ضروری سمجھتے ہیں۔ دلیل کیا ہے؟

نبی ﷺ کی حدیث ہے:

«إِذَا صَلَّيْتُمْ عَلَى الْمَيِّتِ فَأَخْلِصُوا لَهُ الدُّعَاءَ»[1]

اس کا صحیح ترجمہ تو یہ ہے کہ جب تم میت کی نمازِ جنازہ پڑھنے لگو، تو اخلاص کے ساتھ اس کے لیے (مغفرت کی) دعا کرو۔ جیسے قرآن مجید میں ہے:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِذَا قُمۡتُمۡ إِلَى ٱلصَّلَوٰةِ فَٱغۡسِلُواْ وُجُوهَكُمۡ ﴾

''اے ایمان والو! جب تم نماز کے لیے کھڑے ہونے لگو، تو وضو کرو۔''[2]

لیکن بریلوی حضرات ﴿إذا صلیتم......﴾ کا ترجمہ کرتے ہیں: ''جب تم نماز پڑھ چکو تو......'' اور اِس طرح ترجمے میں بددیانتی کا ارتکاب کر کے جنازے کے بعد دعا مانگنے کے اپنے غیر مسنون عمل کا جواز ثابت کرتے ہیں، حالانکہ اگر یہ ترجمہ صحیح ہے تو پھر ان کو وضو بھی نماز کھڑے ہونے کے بعد ہی کرنا چاہیے، نہ کہ نماز سے پہلے۔ جیسا کہ

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِذَا قُمۡتُمۡ إِلَى ٱلصَّلَوٰةِ فَٱغۡسِلُواْ وُجُوهَكُمۡ ﴾

کا ترجمہ بریلوی استدلال کے مطابق کرنے کا اقتضاء ہے۔

چوتھی مثال: یہی حال ان احادیث کی صحت و ضعف کے معاملے میں ہے جو اختلافی مسائل میں مدارِ بحث بنتی ہیں۔ ان میں نہایت بے خوفی کے ساتھ امانت و دیانت کا خون کر کے ثقہ راویوں کو ضعیف اور ضعیف راویوں کو ثقہ ثابت کرنے پر سارا زور صرف کیا جاتا ہے، جس کی

---

[1] سنن أبي داود، الجنائز، باب الدعاء للميت، حديث: 3199

[2] المائدة 6:5

تفصیل [التنکیل بما فی تأنیب الکوثری من الأباطیل] (عربی) تالیف شیخ عبدالرحمٰن بن یحییٰ یمانی میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ اس میں ایک لطیفہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک راوی اپنی کسی من پسند روایت میں ہوتا ہے، تو اسے اس وقت ثقہ باور کرایا جاتا ہے اور وہی راوی جب اس روایت میں آتا ہے جس سے دوسرا فریق استدلال کرتا ہے، تو وہ ضعیف قرار پا جاتا ہے۔ ایک اور لطیفہ یہ ہوتا ہے، کہ ایک حدیث میں دو تین باتیں ہوتی ہیں، ان میں سے کوئی ایک بات تو قبول کر لی جاتی ہے کہ اس سے ان کے کسی فقہی مسئلے کا اثبات ہوتا ہے اور دوسری باتیں ردّ کر دی جاتی ہیں کیونکہ وہ فریق مخالف کے موافق ہوتی ہیں، حالانکہ حدیث ایک ہے، سند ایک ہے، اگر وہ حدیث صحیح ہے تو اس میں بیان کردہ ساری ہی باتیں صحیح ہیں، ان میں سے کسی بات کو مان لینا اور بعض کو نہ ماننا، اسے کون معقول طرز عمل قرار دے سکتا ہے؟ اسی طرح اگر وہ ضعیف ہے، تب بھی معاملہ ایسا ہی ہے، اس کی ساری ہی باتیں ناقابل تسلیم ہونی چاہییں۔ اس کا کوئی ایک جُز قابل استدلال نہیں ہوسکتا۔

یہ لطائف ہمارے فقہی جدل و مناظرہ میں عام ہیں۔ ظاہر بات ہے، امانت و دیانت کی موجودگی میں ان کا امکان ہے، نہ جواز ہی ہے۔

❸ محدثین کے منہج کی تیسری نمایاں خوبی جمع و تطبیق کا اہتمام ہے۔ بعض روایات میں جو ظاہری تعارض نظر آتا ہے، اس کے حل کے لیے محدثین حسب ذیل طریقے اختیار کرتے ہیں:

① سند کے اعتبار سے اگر ایک روایت صحیح ہے اور دوسری ضعیف، تو صحیح السند روایت کو وہ قبول کر لیتے اور ضعیف کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

② اگر سند کے اعتبار سے دونوں صحیح ہوتی ہیں، لیکن درجۂ صحت میں ایک کو دوسری پر کسی وجہ سے برتری حاصل ہوتی ہے، تو وہ راجح قرار پاتی ہے۔ جیسے ایک روایت سنن کی ہے، جب کہ دوسری متفق علیہ یا صحیح بخاری یا صحیح مسلم کی ہے، تو یہ دوسری قسم کی روایات صحت

کے اعتبار سے سنن اربعہ کی روایات سے فائق ہیں۔ ان کو سنن کی روایات پر ترجیح حاصل ہوگی۔

③ بعض متعارض روایات میں قرائن سے تقدیم وتاخیر کا علم بھی ہو جاتا ہے۔ وہاں مؤخر روایت کو ناسخ اور مقدم روایت کو منسوخ تسلیم کرلیا جاتا ہے۔

④ جہاں تقدیم و تاخیر کا علم بھی نہ ہو اور صحت کے لحاظ سے بھی دونوں یکساں ہوں، تو محدثین دونوں روایات کا ایسا محمل اور مفہوم بیان کرتے ہیں جس سے ان کا ظاہری تعارض دور ہو جاتا ہے، اس کو جمع و تطبیق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

جیسے مزارعت کی احادیث ہیں، بعض سے مزارعت کا جواز ثابت ہوتا ہے، بعض سے ممانعت۔ محدثین نے کہا: ممانعت کا تعلق ان صورتوں سے ہے جن میں کسی ایک فریق پر ظلم وزیادتی کا امکان ہے، اور جن میں ایسی صورت نہ ہو، وہاں جواز ہے۔

اس طرح کئی اور احادیث ہیں جن میں کسی میں نہی ہے، تو کسی میں جواز ہے۔ یہاں محدثین نہی کو نہی تنزیہی قرار دیتے ہیں، یعنی اس کام کو نہ کرنا بہتر ہے، تاہم کسی موقعے پر اسے کرلیا جائے تو اس کا جواز ہے، جیسے کھڑے ہوکر پانی پینے کی ممانعت کی روایات بھی ہیں اور جواز کی بھی۔ اس میں بھی تطبیق یہی ہے کہ بیٹھ کر پانی پینا بہتر ہے، تاہم کھڑے ہوکر پینا بھی جائز ہے۔ وعلیٰ ھذا القیاس اس طرح کی دیگر روایات ہیں۔

منہجِ محدثین سے انحراف کرنے والے جمع و تطبیق کے معاملے میں بھی بہت سے گھپلے کرتے ہیں، وہ حدیث کو اہمیت دینے کے بجائے فقہی اقوال و آراء کو اہمیت دیتے ہوئے بعض متعارض روایات میں خلافِ واقعہ ناسخ ومنسوخ کا فیصلہ کرتے ہیں، جیسے بعض لوگ کہتے ہیں کہ رفع الیدین کی احادیث منسوخ ہیں اور رفع الیدین نہ کرنے کی احادیث ناسخ ہیں، جبکہ اس کی کوئی معقول دلیل ان کے پاس نہیں ہے حتیٰ کہ مولانا انور شاہ کشمیری نے بھی اس دعوے کی

نفی کی ہے۔لیکن اپنے عوام کو مطمئن کرنے کے لیے اس قسم کے دعوے ان کی طرف سے عام ہیں۔اور بعض ستم ظریف تو یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ ابتدا میں رفع الیدین کا حکم اس لیے دیا گیا تھا کہ لوگ اپنی بغلوں میں بُت چھپا کر لے آیا کرتے تھے۔جب بتوں کی یہ محبت ختم ہو گئی، تو رفع الیدین کا حکم بھی منسوخ ہو گیا۔

﴿مَّا لَهُم بِهِۦ مِنْ عِلْمٍ وَلَا لِآبَآئِهِمْ ۚ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَٰهِهِمْ ۚ إِن يَقُولُونَ إِلَّا كَذِبًا﴾ [1]

یا محدثین کرام کی اس طرح توہین کرتے ہیں کہ محدثین تو محض عطار (دوا فروش) تھے، جس طرح ایک عطار اپنی دکان پر ہر طرح کی جڑی بوٹیاں رکھتا ہے،لیکن وہ ان کے خواص اور تاثیرات سے لاعلم ہوتا ہے۔ان کے خواص و تاثیرات سے ایک طبیب حاذق ہی واقف ہوتا ہے۔مجتہدین یا فقہاء کی حیثیت بھی طبیب حاذق کی طرح ہے۔ایک فقیہ ہی نے یہ فیصلہ کرنا ہے کہ محدثین نے اپنی دکان (احادیث کے مجموعوں) میں جو (نعوذ باللہ) ہر طرح کی جڑی بوٹیاں (احادیث) جمع کر لی ہیں۔ان میں سے کون سی حدیث کو لینا ہے اور کس کو ترک کرنا ہے؟ یعنی تطبیق و ترجیح یا اخذ و ترک کا فیصلہ نقد و تحقیق حدیث کے مسلمہ اصولوں کی روشنی میں نہیں، بلکہ فقیہ نے اپنی فقاہت کی روشنی میں کرنا ہے۔اور یہ فقاہت ایک مخصوص عینک کا نام ہے۔ہری عینک والے کو ہر چیز ہری، کالی عینک والے کو کالی اور لال عینک والے کو لال نظر آتی ہے۔چنانچہ حنفی فقیہ کا استدلال کچھ ہوتا ہے، شافعی فقیہ کا کچھ، وھلم جرا، اس لیے کہ ان سب کی عینکیں الگ الگ رنگ کی ہیں۔اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسلام کی تعبیر

شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیرہا

کی آئینہ دار بن جاتی ہے۔محدثین کی صاف شفاف، بے غبار اور بے آمیز عینک کوئی

---

[1] الکھف 5:18

استعمال نہیں کرتا، جس میں ہر چیز اپنی صحیح اور اصلی شکل میں نظر آتی ہے۔

طبیب حاذق کی یہ حذاقت یا فقیہ کی یہ فقاہت ہی یا الگ الگ رنگ کی یہ عینکیں ہی افتراقِ امت کے المیے کا سب سے بڑا سبب ہے، اس لیے جب تک محدثین کے منہج و مسلک کو اختیار نہیں کیا جائے گا، اس افتراق کا سدِّ باب ممکن نہیں ہے۔

محدثین کرام رحمہم اللہ کو فقاہت سے عاری محض ایک عطّار کہنا، اِسی طرح خلافِ واقعہ اور ان کی توہین ہے، جیسے نور الانوار اور اصول الشاشی وغیرہ میں حضرت ابو ہریرہ اور حضرت انس رضی اللہ عنہما جیسے صحابہ کو غیر فقیہ قرار دینا خلافِ واقعہ اور ان کی توہین ہے۔ اور یہ دونوں ہی باتیں انکارِ حدیث کے چور دروازے ہیں۔ مذکورہ صحابہ کو غیر فقیہ قرار دینے سے مقصود بھی ان کی بیان کردہ روایات سے جان چھڑانا اور اپنے قیاس ورائے کو ترجیح دینا ہے۔ اسی طرح محدثین کو عطار کہنے سے مقصود بھی ان کی جمع کردہ حدیثوں کے مقابلے میں فقہاء کی موشگافیوں کو اختیار کرنا ہے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ مذکورہ صحابی غیر فقیہ تھے، نہ محدثین کرام ہی فقاہت سے عاری تھے۔ ان کی فقاہت تو ابواب بندی (تراجم) ہی سے واضح ہو جاتی ہے، بالخصوص امام بخاری رحمہ اللہ کی فقاہت تو ان کے ایک ایک ترجمۃ الباب سے نمایاں ہے۔ اِسی لیے کہا جاتا ہے، [فِقْهُ الْبُخَارِيِّ فِي تَرَاجِمِه] ''امام بخاری کی فقاہت ان کے تراجم میں ہے۔'' تاریخِ اسلام کے ایسے بے مثال فقیہ کو محض عطّار کہنا، ایک ایسی شوخ چشمانہ جسارت ہے جس کا حوصلہ ایسے ہی لوگ کر سکتے ہیں جن کے دلوں میں حدیث کی عظمت کے بجائے فقیہا نہ قیل وقال کا احترام زیادہ ہے۔ سبحٰنك هذا بهتان عظيم.

بہر حال بات ہو رہی تھی محدثین کرام کے جمع وتطبیق کے اصولوں کی۔ اگر اِن اصولوں کو ان مسائل میں بھی اختیار کر لیا جائے جو فریقین کے درمیان مابہ النزاع ہیں، تو بہت سے نزاعات کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ اور اگر محدثین کی مذکورہ تینوں امتیازی خصوصیات ہی کو اپنا لیا

جائے، جن کی وضاحت کی گئی ہے تو بیشتر اختلافات کا خاتمہ ممکن ہے۔ اختلافات کی بنیاد، حدیث کے بارے میں نقطۂ نظر کا فرق ہی ہے۔ جب تک نقطۂ نظر کا یہ فرق ختم نہیں ہوگا اور حدیث کی عظمت کو اس طرح تسلیم نہیں کیا جائے گا جس طرح کہ اس کا حق ہے، اور احادیثِ صحیحہ کو کسی بھی عنوان، حیلے یا وضعی اصولوں سے ردّ کرنے کا طریقہ نہیں چھوڑا جائے گا، جن کی بابت پورے یقین واذعان سے ہمارا دعوٰی ہے کہ اِمام ابوحنیفہ کا ان اصولوں سے کوئی واسطہ نہیں ہے، اس وقت تک اختلافات کا خاتمہ تو کجا، ان کی شدّت کو کم بھی نہیں کیا جاسکتا۔

اب یہ علمائے احناف کی ذمے داری ہے کہ اگر ان کو امتِ مسلمہ کی وحدت مطلوب ہے، اور یقیناً ان کو مطلوب ہے، تو وہ اس کے لیے راستہ بھی وہ اختیار کریں جو اس مطلوب تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے اور وہ وہی ہے جسے ہم نے عظمت حدیث سے تعبیر کیا ہے اور جس کی وضاحت گزشتہ سطور میں کی گئی ہے۔ ہمیں فقہائے کرام سے کوئی کد ہے نہ ان کی فقہی کاوشوں سے بے اعتنائی۔ ہم فقہاء کے احترام کے بھی قائل ہیں اور ان کے فقہی سرمائے کی قدر و قیمت کے بھی۔ ہماری تو صرف ایک ہی گزارش ہے اور وہی ہمارا مسلک و موقف بھی ہے کہ فقہائے کرام کے ساتھ محدثین عظام کی عظمت کو بھی دل سے تسلیم کیا جائے اور فقہی اقوال و آراء کے مقابلے میں حدیث کی عظمت و اہمیت اور اس کی قدر و منزلت کو مجروح نہ کیا جائے۔

وما علینا إلا البلاغ المبین

3

سننِ اربعہ

سنن اربعہ سے مراد سنن ابو داود، سنن ترمذی، سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ ہیں۔ برِّصغیر پاک و ہند میں ''صحاح سِتّہ'' کی اصطلاح معروف اور زبان زدِ عام و خاص ہے۔ اور اس سے حدیث کی چھ کتابیں مراد ہوتی ہیں۔ چار مذکورہ سنن اربعہ اور صحیح بخاری و صحیح مسلم۔ ان آخری دو کتابوں کو الگ ''صحیحین'' کہا جاتا ہے۔ ان آخر الذکر دونوں کتابوں کی بابت تو اہل سُنّت کے ہاں یہ بات مسلّمہ ہے کہ یہ دونوں کتابیں صحیح احادیث کے مجموعے ہیں، ان میں کوئی بھی روایت سند کے اعتبار سے ضعیف نہیں ہے۔ اِسی لیے شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے اِن دونوں کتابوں کی بابت کہا ہے:

«أَمَّا الصَّحِيحَانِ فَقَدِ اتَّفَقَ الْمُحَدِّثُونَ عَلٰى أَنَّ جَمِيعَ مَا فِيهِمَا مِنَ الْمُتَّصِلِ الْمَرْفُوعِ، صَحِيحٌ بِالْقَطْعِ وَأَنَّهُمَا مُتَوَاتِرَانِ إِلٰى مُصَنِّفَيهِمَا وَأَنَّهُ كُلُّ مَنْ يُّهَوِّنُ أَمْرَهُمَا فَهُوَ مُبْتَدِعٌ مُّتَّبِعٌ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ»

''صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی بابت محدثین کا اتفاق ہے کہ ان میں جتنی بھی متصل مرفوع

احادیث ہیں، وہ قطعی طور پر صحیح ہیں اور وہ اپنے مصنفین تک متواتر ہیں، نیز یہ کہ جو شخص بھی ان دونوں (مجموعہ ہائے حدیث) کی شان گھٹاتا ہے، وہ بدعتی ہے اور مومنوں کا راستہ چھوڑ کر کسی اور راستے کا پیروکار ہے۔''[1]

البتہ سنن اربعہ کی بابت سب تسلیم کرتے ہیں کہ ان میں کچھ حصہ ضعیف احادیث کا بھی ہے، انھیں ''صَحِیحَیْن'' کے ساتھ ملا کر جو ''صحاح سِتّہ'' (حدیث کی چھ صحیح کتابیں) کہا جاتا ہے، اس کی وجہ ان میں صحاح کی تعداد کا زیادہ ہونا اور ضعاف کا کم ہونا ہے۔ گویا انھیں بہ حیثیت مجموعی صحیح قرار دیا گیا ہے، نہ کہ اس اعتبار سے کہ وہ صحیح بخاری وصحیح مسلم کی طرح من حیث الکل صحیح ہیں۔ تاہم ''صحاح ستہ'' کی اصطلاح سے عوام میں یہ تأثر ضرور پھیلا کہ یہ چھ کی چھ کتابیں صحیح احادیث کے مجموعے ہیں اور علماء سے تعلق رکھنے والا ایک بہت بڑا طبقہ بھی، جو فنِ نقدِ حدیث اور اسماء الرجال سے بالعموم ناآشنا ہے، کسی حدیث کا سنن اربعہ میں سے کسی کے اندر ہونے کو صحت کے لیے کافی سمجھتا ہے۔ بالخصوص بحث وجدال میں اس اصطلاح سے خوب فائدہ اُٹھایا جاتا ہے، اور ان کتابوں کا حوالہ دے کر ان کی ضعیف احادیث کو بھی صحیح باور کرایا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں خود علماء کی اکثریت کے لیے بھی یہ معلوم کرنا کہ ان میں صحیح کون سی ہے اور ضعیف کون سی؟ نہایت مشکل امر تھا، کیونکہ اصولِ حدیث اور اسماء الرجال میں دسترس کے بغیر یہ فیصلہ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ اور علوم حدیث میں اس قسم کی مہارت اور عبور رکھنے والے علماء نہایت اقل قلیل ہوتے ہیں۔

یہ صورتِ حال عرصۂ دراز سے یوں ہی چلی آ رہی تھی کہ اس دَور میں محدثِ عصر اور عظیم محقق علامہ شیخ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ (مُتوفّٰی 1999ء) کو اللہ تعالیٰ نے تجدیدی شان کے ساتھ احادیث کی تحقیق کا مہتم بالشان کام کرنے کی توفیق سے نوازا۔ شیخ کی مساعیٔ حسنہ کی

---

[1] حجة الله البالغة: 134/1 طبع المكتبة السلفية، لاهور

بدولت تحقیق حدیث کا یہ کام، جو مؤلفینِ کتب حدیث کے بعد جمود یا تساہل کا شکار چلا آ رہا تھا، نئے آہنگ اور نئے عزم کے ساتھ شروع ہوا۔ شیخ البانی رحمہ اللہ نے ایک طرف تو اپنے تلامذہ کی ایسی ٹیم تیار کی جو شیخ ہی کی طرح تحقیقِ حدیث کے محدثانہ ذوق سے بہرہ ور ہے، اور دوسری طرف خود بھی نہایت وسیع پیمانے پر تحقیقِ حدیث کا کام سرانجام دیا جس کی مختصر تفصیل حسب ذیل ہے:

ان کی ایک عظیم خدمتِ حدیث یہ ہے کہ انھوں نے سنن اربعہ کی احادیث کی تحقیق اور چھان پھٹک کر کے ضعیف اور صحیح دونوں قسم کی روایات کو الگ الگ کر کے ہر کتاب کو دو دو حصوں میں تقسیم کر دیا، ایک حصے میں صحیح روایات اور دوسرے حصے میں ضعیف روایات۔ جس سے اس بات کی وضاحت ہوگئی کہ اِن چاروں کتابوں کی حدیثیں صحیح بخاری و صحیح مسلم کی طرح، ساری کی ساری، صحیح نہیں ہیں۔ اور کسی حدیث کا محض سنن میں ہونا ہی اس کے مستند ہونے کے لیے کافی نہیں ہے، بلکہ محدثانہ اصول کی روشنی میں ان کی صحت وضعف کا فیصلہ کرنا ضروری ہے۔ شیخ رحمہ اللہ نے فیصلہ کر کے اور دو دو حصوں میں تقسیم کر کے علماء کو آسانی مہیا فرما دی۔ اب ہر عالم، جو تحقیقِ حدیث کے فن سے آشنائی یا اس میں درک اور تجربہ نہیں رکھتا (اور اکثریت ایسے ہی علماء کی ہے) وہ بھی ان میں موجود روایات سے آگاہی حاصل کر سکتا ہے کہ کون سی روایت صحیح ہے اور کون سی ضعیف؟ علاوہ ازیں شیخ البانی رحمہ اللہ کا یہ موقف بھی تھا کہ ''صحاح ستہ'' کی اصطلاح قابلِ اصلاح ہے۔ وہ فرماتے تھے کہ بخاری و مسلم کو صحیحین (حدیث کے دو صحیح مجموعے) اور باقی چار کتابوں کو سنن اربعہ کہا جائے اور صحاحِ ستہ کی اصطلاح ترک کر دی جائے تاکہ لوگ سنن اربعہ کو بھی صحیحین کی طرح صحیح احادیث کا مجموعہ نہ سمجھیں۔ اور ان سب کو کتب ستہ سے تعبیر کیا جائے۔

شیخ البانی رحمہ اللہ کے اِس عظیم کارنامے کی بعض لوگ تحسین کے بجائے، اِس پر تنقید کرتے

ہیں کہ یہ سنن اربعہ صدیوں سے متداول چلی آ رہی ہیں، ان میں بنیادی تبدیلی کر کے، ان کی اصل حیثیت کو مجروح کر دیا گیا ہے، لیکن اس اعتراض میں کوئی معقولیت نہیں ہے۔ جب شیخ نے محدثانہ اصولِ نقد و جرح ہی کی روشنی میں ایسا کام کیا ہے جس کی فی الواقع شدید ضرورت تھی اور جس کی اہلیت و صلاحیت سے اکثر علماء عاری ہوتے ہیں، تو علماء کے لیے یہ آسانی بہم پہنچا دینا کہ وہ صحیح اور ضعیف روایات کو پہچان سکیں، تحسین و آفرین کے قابل ہے، نہ کہ تقبیح و تہجین کے۔ باقی رہا یہ اعتراض کہ ضروری نہیں کہ شیخ البانی نے جس حدیث کو صحیح یا ضعیف حصے میں درج کیا ہے، وہ واقعی صحیح یا ضعیف ہو، بلکہ عین ممکن ہے کہ جس حدیث کو انھوں نے صحیح سمجھا ہو، وہ ضعیف ہو اور جس کو ضعیف قرار دیا ہو، وہ صحیح ہو، اس لیے ایسے کام کا کیا فائدہ؟ لیکن ہم عرض کریں گے کہ جہاں تک خطا کا تعلق ہے، وہ تو مسلّم ہے۔ کوئی بھی انسانی محنت و کاوش امکانِ خطا سے پاک نہیں، لیکن کیا محض امکانِ خطا سے یا چند روایات میں خطا سے اس سارے کام کی قدر و قیمت ختم ہو جائے گی جو شیخ نے کیا ہے؟ ایسا کہنا یا سمجھنا یکسر غلط ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان کے صحت و ضعف کے حکم سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، علم و تحقیق کا یہ دروازہ تو ہمیشہ سے کھلا رہا ہے اور کھلا رہے گا، اور جب تک یہ دروازہ کھلا ہے، شیخ البانی مرحوم کی تحقیقات سے بھی دلائل کی رُو سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور کیا جاتا رہے گا۔ لیکن محض چند روایات میں اختلاف یا خطا کے امکان سے شیخ مرحوم کی اس عظیم الشان خدمت کی تحقیر نہیں کی جا سکتی جس کی توفیق صدیوں بعد اللہ نے ان کو عطا فرمائی جس سے علماء کی اکثریت سنن اربعہ میں موجود ضعیف روایات سے آگاہ ہوئی، جب کہ اس سے پیشتر وہ اس سے نہ صرف بے خبر تھی بلکہ تحقیق حدیث کی اہلیت سے بھی محروم تھی اور محروم ہے۔

ایں سعادت بہ زور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

وہ یقیناً اس شعر کا مصداق تھے ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اس کے علاوہ بھی شیخ مرحوم نے متعدد کتابوں کی احادیث کی تحقیق کی، جیسے مشکوٰۃ المصابیح ہے، سید سابق مصری کی ''فقه السنة'' ہے، یوسف قرضاوی کی ''الحلال والحرام'' ہے، ابن ابی عاصم کی ''السنة'' ہے، حافظ ابن القیم کی ''زاد المعاد'' ہے، فقہ حنبلی کی کتاب ''منار السبيل'' ہے۔ اس کی احادیث کی تخریج ''ارواء الغليل'' کے نام سے 9 جلدوں میں چھپی ہوئی ہے۔ اور دیگر بعض کتب ہیں۔ ان کے علاوہ انھوں نے ''سلسلة الأحاديث الصحيحة'' اور ''الأحاديث الضعيفة'' میں ہزاروں احادیث کی چھان پھٹک کا عظیم کارنامہ سرانجام دیا جو احادیث کی غیر متداول کتابوں میں موجود ہیں اور وہ عام دسترس سے باہر ہیں۔ جزاه الله أحسن الجزاء۔

شیخ رحمہ اللہ کی اس محنت و کاوش اور تالیفات و تحقیقات کا صرف یہی فائدہ نہیں ہوا کہ عام علماء کے لیے آسانی پیدا ہوگئی، بلکہ ایک دوسرا بڑا فائدہ یہ بھی ہوا کہ اس ایک چراغ سے بہت سے چراغ روشن ہوئے، تحقیقِ حدیث کا ذوق عام ہوا، اور اب دسیوں، بیسیوں نہیں، سینکڑوں کی تعداد میں ایسے علماء و محققین ہیں جو شیخ کے منہج پر، جو دراصل محدثین ہی کا منہج ہے، حدیث کی تخریج و تحقیق کا کام کر رہے ہیں۔ اور مشرق سے لے کر مغرب تک، جنوب سے لے کر شمال تک، عرب و عجم میں ہر جگہ احادیث کے مجموعوں کو تحقیق و تدقیق کے مراحل سے گزارا جا رہا ہے تا کہ صحیح احادیث ضعیف احادیث سے الگ اور ممتاز ہو جائیں۔

دوسری عظیم خدمت، جو شیخ البانی نے سرانجام دی، وہ ہے حدیث کی حجیت و استناد کا اثبات اور عمل بالحدیث کے جذبے کا اِحیاء و فروغ۔ اس سے بھی جدید و قدیم منکرینِ حدیث

کے شبہات کا ازالہ ہوا، فقہی جمود ٹوٹا اور تقلید کی جکڑ بندیاں ڈھیلی ہوئیں۔ یہ دونوں کام اگرچہ تقریباً ایک صدی سے سلفی تحریک کے ذریعے سے ہو رہے تھے، لیکن شیخ نے اپنے افکار، دعوت وتبلیغ، تدریس وتعلیم اور تالیفات وتحقیقات کے ذریعے سے اس تحریکِ سلفیت میں ایک نئی روح پھونکی اور اسے عالمی جہتوں سے ہم کنار کر کے پورے عالم اسلام میں اس کے اثرات پھیلا دیے۔ اس سلفی ذہن و جذبے کے اِحیاء وفروغ میں سعودی عرب کے مفتی اعظم شیخ ابن باز رحمہ اللہ کا بھی بڑا حصہ ہے، اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ اس دَور میں ان دونوں عظیم اور عبقری شخصیات نے دین کی تجدید اور اس کے اِحیاء کا کام جس شدّت اور قوت سے کیا ہے، وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آیا، تو اس میں قطعاً مبالغہ نہیں ہوگا۔ اس اعتبار سے یہ دونوں شخصیات، حدیث کا مصداق ہیں۔ والعلم عند اللہ.

«إِنَّ اللهَ عَزَّوَجَلَّ يَبْعَثُ لِهَذِهِ الْأُمَّةِ عَلٰى رَأْسِ كُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ مَّنْ يُّجَدِّدُ لَهَا دِينَهَا»[1]

[1] سنن أبي داود، الملاحم، باب مايذكر في قرن المائة، حديث :4291 و صحيحة الألباني في سلسلة الأحاديث الصحيحة، حديث :599

4

حدیث کی صحت وضعف میں اختلاف اور اس کے اسباب

علم عِلَلِ حدیث دنیا کا سب سے زیادہ نازک اور باریک ترین علم ہے، اس میں صحت و ضعف کے فیصلے کی تبدیلی کے امکانات سب سے زیادہ ہیں۔ یہ فن ایک بحرِ ناپیدا کنار ہے، اس کی غوّاصی سے نئی نئی چیزیں برآمد ہوتی رہتی ہیں۔ مثلاً:

ایک محقق نے ایک مُدلِّس کی روایت کو عَنعَنَہ کی وجہ سے ضعیف قرار دیا، لیکن ایک دوسرے محقق کو اس کی تحدیث یا سماع کی صراحت مل گئی، اور اس طرح وجہ ضُعف ختم ہو گئی۔

یا کسی ضعیف روایت کے متابعات وشواہد صحیح سند کے ساتھ مل گئے، جو پہلے علم میں نہیں آئے تھے، ان متابعات وشواہد کی وجہ سے روایت کا ضعف دور ہو گیا۔

یا کسی مرسل روایت کا ایسا طریق مل گیا، جو موصول تھا، اس لیے ارسال کی وجہ سے جو ضُعف تھا، وہ دُور ہو گیا۔ یا کسی مُختَلِط راوی کی روایت کو اس کے اختلاط کی وجہ سے ضعیف قرار دیا گیا، لیکن دوسرے محقق کو اس بات کے شواہد مل گئے کہ اس کی یہ روایت تو اختلاط سے

قبل کی ہے، اور یوں وجہ ضعف دور ہو گئی۔

بہر حال یہ اور اس قسم کے دوسرے اسباب ضعف بعض دفعہ دور ہو جاتے ہیں اور روایت صحیح قرار پا جاتی ہے۔ اور یہی معاملہ صحیح روایت کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک محقق کے نزدیک اس میں بظاہر ضعف کی کوئی وجہ نہیں ہوتی، اس لیے وہ اسے صحیح قرار دے دیتا ہے، لیکن کسی اور محقق کے علم میں اس کے ضعف کے اسباب آ جاتے ہیں جن کی بنا پر اس کے لیے اسے ضعیف قرار دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔

اور یہ بھی ضروری نہیں کہ دوسرے محقق ہی کے علم میں ایسی معلومات آئیں جن سے حدیث کا حکم بدل جائے، بلکہ خود فیصلہ کرنے والے کے علم میں بھی نئی معلومات آ سکتی ہیں جن کی وجہ سے اس کا پہلا فیصلہ غلط قرار پائے۔ شیخ البانی رحمہ اللہ جن کی عمر فنِّ حدیث کی خدمت میں گزری، اور ان کا ایک ایک لمحہ اسی کام کے لیے وقف رہا، انھوں نے سیکڑوں حدیثوں کی بابت اپنا فیصلہ تبدیل کیا، جن کو ان کے بعض تلامذہ نے ''تراجع العلامة الألبانی فیما نصّ علیه تصحیحاً وَّ تضعیفاً'' کے نام سے شائع بھی کر دیا ہے۔

جب واقعہ یہ ہے تو ایک حدیث کی بابت دو محققوں کے ایک دوسرے سے مختلف فیصلے سے عوام کو گھبرانا یا تشویش میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ اہلِ علم کے لیے دونوں فیصلوں کا سامنے رہنا مفید ہے۔ شاید کوئی اور محقق اس میدان میں سامنے آئے اور وہ موازنہ کر کے دونوں میں سے کسی ایک کے فیصلے کو دلائل کی رُو سے راجح قرار دے دے۔ یا اپنا حقِ نظر ثانی استعمال کر کے خود محقق ہی اپنا فیصلہ تبدیل کر لے۔ علاوہ ازیں ایسی مختلف فیه روایت پر عمل کرنے میں عوام کو اختیار ہے، اگر وہ ایک ضعیف حدیث پر اس وجہ سے عمل کر لیں گے کہ ایک محقق نے اس کو صحیح قرار دیا ہے، تو امید ہے کہ وہ محقق ہی کی طرح عنداللہ ماجور ہوں گے، کیونکہ محقق اور عوام دونوں کے سامنے کوئی مخصوص فقہ اور اس کے مسائل نہیں ہیں، بلکہ حدیث کی عظمت

ہی اس پر عمل کرنے کی محرک ہے۔ اور اگر اس پر عمل نہیں کریں گے، تو وہ ان شاء اللہ گناہ گار نہیں ہوں گے، کیونکہ ایک محقق نے بہر حال اس کی تحقیق کر کے ہی اسے ضعیف قرار دیا ہے، گو نفس الامر میں وہ صحیح ہی ہو۔

اس میں اصل بنیاد دو چیزیں ہیں۔ ایک نیت، دوسری دیانت دارانہ محنت۔ نیت یہ ہو کہ حدیث رسول پر عمل کرنا ہے۔ دوسرے، یہ کہ صحیح حدیث کی تلاش و جستجو اور اس کی صحت و ضعف کی تحقیق میں اس نے کوتاہی نہ کی ہو۔ ان دو چیزوں کے بعد وہ اُن میں کامیاب ہو گیا تب بھی، اور ناکام رہا تب بھی۔ دونوں ہی صورتوں میں وہ عنداللہ فائز المرام ہی رہے گا۔ محدثین کے بیان کردہ اصولوں اور وضاحتوں سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے جو ہم بیان کر رہے ہیں۔ مثلاً محدثین کی بعض وضاحتیں حسب ذیل ہیں:

جب کسی حدیث کی بابت کہا جائے ''هذا حديثٌ صحيحٌ'' تو اس سے مراد نفس الأمر میں حدیث کا قطعی صحیح ہونا نہیں ہوتا، کیونکہ اس میں ثقہ رُواۃ کی خطا و نسیان کی گنجائش باقی رہتی ہے۔[1]

اسی طرح ''هذا حديثٌ، غير صحيحٍ'' (یہ حدیث صحیح نہیں ہے) سے مراد نفس الامر میں حدیث کا کذب (جھوٹا) ہونا نہیں ہوتا، کیونکہ کاذب راوی کے صدق کا اور کثیر الخطا راوی کی اصابت کا امکان باقی رہتا ہے۔[2]

''رجاله رجال الصحيح'' (اس کے راوی صحیح کے راوی ہیں) کہنا بھی صحتِ حدیث

---

[1] لیکن محض ظن کی بنیاد پر اس کی صحت میں شک نہیں کیا جا سکتا بلکہ اسے صحیح ہی تصور کیا جائے گا اور اس پر عمل کیا جائے گا تاوقتیکہ اس کا ضعف واضح ہو جائے۔

[2] لیکن اس امکان کے پیش نظر کہ ممکن ہے وہ صحیح ہو اس پر عمل درست نہیں ہے، تاوقتیکہ اس کی صحت کی دلیل مل جائے۔ اس لیے صحت حدیث ثابت ہونے کے بعد وہ صحت قطعی ہی ہوگی تاوقتیکہ ضعف کی دلیل مل جائے اسی طرح وہ ضعف بھی قطعی ہی ہوگا تاوقتیکہ اس کی صحت واضح ہو جائے۔ (عثمان منیب)

کی قطعی دلیل نہیں ہوتا، کیونکہ صحیحین یا صحیح کے بعض راوی مُتکَلَّم فیہ بھی ہیں۔ اور شَیخَین (امام بخاری و امام مسلم) ان سے صرف اسی وقت روایت کرتے ہیں جب ان کی متابعت پائی جاتی ہو یا ان کے شواہد ہوں یا ان کو علم ہو کہ ان کی کوئی اصل موجود ہے۔ اِسی لیے اگر وہ راوی کسی روایت میں منفرد ہوں یا ثقات کے خلاف روایت کریں، تو ایسی صورت میں وہ ان سے روایت نہیں کرتے، پس صحیح کے راوی ہونے کے باوجود اس بات کا احتمال رہتا ہے کہ اُس محدث کی شرائط میں سے ایسی کوئی شرط مفقود ہو جس کو صاحبِ صحیح نے بہ وقتِ تصحیح و تخریج ملحوظ رکھا تھا۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، کتاب ''ضعیف احادیث کی معرفت اور ان کی شرعی حیثیت'' تالیف غازی عزیر، الجُبَیل، سعودی عرب)

ان اصولوں یا وضاحتوں سے مقصود اس بات کو واضح کرنا ہے کہ احادیث کی تحقیق کا فن کثیر الجہات ہونے کی وجہ سے نہایت دقیق اور از حد مشکل ہے۔ اِس میں پوری کوشش کرنے کے باوجود دوسرے پہلو کا امکان رہتا ہے، تاہم جب تک دوسرے پہلو کی واضح اور قطعی دلیل نہ ملے، پہلی ہی بات اور فیصلے پر عمل کیا جائے گا، اِس لیے جن احادیث کی صحت و ضعف میں دو محققین کا اختلاف ہو، وہاں تو دوسرے پہلو کا امکان زیادہ ہے۔ بنا بریں کسی حدیث کی صحت و ضعف میں اختلاف کی صورت میں عوام کے لیے اختیار کی گنجائش بھی ہے جیسا کہ پہلے وضاحت کی گئی ہے۔

ضعیف حدیث مطلقاً نا قابل عمل ہے

یہ بات یاد رہے کہ یہ اختیار صرف مختلف فیہ روایات میں ہے لیکن جو روایت متفقہ طور پر ضعیف ہے، اس پر عمل کرنا جائز نہیں ہے۔ ضعیف حدیث کے بارے میں اگرچہ اختلاف ہے لیکن راجح مسلک اس پر عمل نہ کرنا ہی ہے۔ اس کی بابت چار مسلک مشہور ہیں، جو حسب ذیل ہیں:

① ضعیف حدیث مطلقاً قابلِ قبول اور بلا شرط لائق عمل ہے۔

② ضعیف حدیث مطلقاً مقبول نہیں، صرف فضائلِ اعمال اور ترغیب وترہیب میں بلاقید شرط مقبول ہے۔

③ فضائلِ اعمال وغیرہ میں ضعیف حدیث چند شرائط کے ساتھ مقبول ہے، مثلاً: (ضعف شدید نہ ہو، یعنی راوی کذّاب، مُتّہم بالکذب اور فاش غلطی کرنے والا نہ ہو۔ وہ حدیث کسی اصلِ عام کے تحت داخل ہو۔) اور اس حدیث پر عمل کرتے وقت اس کے ثبوت کا اعتقاد نہ رکھا جائے۔

④ ضعیف حدیث پر عمل مطلقاً ناجائز ہے، یعنی نہ احکام ومسائل میں اس پر عمل کرنا جائز ہے، نہ فضائلِ اعمال میں، اور نہ مشروط اور نہ غیر مشروط طور پر، یعنی ضعیف حدیث کسی لحاظ سے بھی قابلِ عمل نہیں ہے۔ (ضعیف احادیث کی معرفت اور ان کی شرعی حیثیت)

قُصّاص و واعظین قسم کے علماء کا ایک گروہ صدیوں سے ایسا چلا آ رہا ہے اور جس کی اب بھی کثرت ہے، جو دوسرے مسلک کا قائل ہے اور وہ فضائلِ اعمال میں ضعیف بلکہ موضوع روایات تک بیان کرنے سے دریغ نہیں کرتا۔ اسی گروہ کی بدولت مسلمان معاشروں میں ضعیف احادیث عوام میں بہت مشہور ہیں اور ان پر عمل بھی عام ہے، حالانکہ علمائے محققین کے نزدیک یہ مسلک صحیح نہیں ہے۔ جب ضعیف حدیث کی نسبت ہی رسول اللہ ﷺ کی طرف مُحقّق (ثابت) نہیں، تو اس حدیث سے کسی عمل کا استحباب کیوں کر ثابت ہوسکتا ہے؟ تاہم محدثین کا ایک گروہ تیسرے مسلک کا قائل ہے، لیکن یہ مسلک چوتھے مسلک ہی کے ساتھ جا ملتا ہے، جب اس میں یہ شرط بھی موجود ہے کہ اس میں ضعف بھی شدید نہ ہو اور وہ کسی اصلِ عام کے تحت بھی داخل ہو، تو گویا عمل تو صحیح حدیث کے عموم ہی پر ہوا، نہ کہ ضعیف حدیث پر، اس لیے سیدھے طریقے پر یہی کہا جائے کہ چوتھا مسلک ہی صحیح اور قابلِ عمل ہے اور وہ یہ ہے کہ ضعیف حدیث، اس کا تعلق احکام ومسائل سے ہو یا فضائل سے، ناقابلِ عمل ہے۔

جن علمائے محققین نے اس نقطۂ نظر سے احادیث کی جانچ پرکھ کی ہے، انھوں نے محدثین ہی کا منہج اختیار کیا ہے اور وہی کام کیا ہے جو امام بخاری و امام مسلم، مؤلفین سنن اربعہ اور دیگر محدثین نے کیا ہے، اس لیے اسی مسلک و منہج کو اختیار کرنے اور اسے ہی فروغ دینے کی ضرورت ہے۔
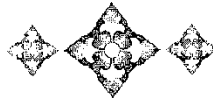
5

اہلِ حدیث عوام وخواص سے چند گزارشات

اس موقع پر ہم مناسب اور ضروری سمجھتے ہیں کہ اہل حدیث عوام و خواص سے بھی کچھ گزارشات کریں۔ ہم جانتے ہیں کہ ضعیف حدیث اور اِس کے بارے میں محدثین کے جس مسلک کی ہم نے وضاحت کی ہے، وہ اہل حدیث حضرات کے لیے کوئی نئی بات نہیں ہے، ان کا الحمدللہ یہی مسلک ہے اور اسی پر وہ عمل پیرا ہیں، کیونکہ وہ محدثین ہی کی جماعت ہیں اور ان کے فکرو منہج کے وہ واحد علم بردار ہیں۔ اور یہ بھی ہم جانتے ہیں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو تقلیدی مذاہب سے بچایا ہے، اِسی طرح وہ اکابر پرستی سے بھی محفوظ ہیں، اس لیے ان کے ہاں یہ بات بھی نہیں ہے کہ فلاں بزرگ نے یہ فرمایا ہے یا فلاں بزرگ کا یہ عمل ہے، قطع نظر اس سے کہ بزرگ کا فرمودہ یا عمل حدیث کے مخالف ہے یا موافق؟ ان کے ہاں کسی بزرگ کی بات یا عمل اسی وقت قابلِ قبول ہوتا ہے جب اس کی بنیاد کسی نصِّ شرعی پر ہوتی ہے، وہ نص واضح ہو یا قیاسِ صحیح کے طریقے پر نص سے مُستَنبَط ہو۔ اس کے بغیر کسی بھی بڑے سے بڑے بزرگ کی کوئی بات یا اس کا عمل اہل حدیث کے ہاں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

لیکن اس دَور میں تحقیقِ حدیث کا جو ذوق عام ہوا ہے اور اس کے نتیجے میں سنن وغیرہ کی بعض روایات جو تحقیق کے بغیر معمول بہ چلی آ رہی تھیں یا علمائے اہل حدیث کی بعض تالیفات میں درج تھیں، علاوہ ازیں ان روایات یا تالیفات کو قبولِ عام کا درجہ بھی حاصل تھا اور ہے، لیکن تحقیق کے بعد وہ روایات پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچیں، تو اہل حدیث نے الحمد للّٰہ بلا تامل ان روایات پر عمل کرنا یا ان کو صحیح سمجھنا چھوڑ دیا۔ ان کا یہ عمل ان کے فکری منہج کے عین مطابق بھی ہے اور ان کے مزاج وتربیت کا حصہ بھی۔

لیکن ہمیں افسوس ہے کہ بعض اہل حدیث عوام وخواص کی طرف سے اس مسلکی منہج اور مزاج وتربیت کے برعکس یہ باتیں سننے میں آ رہی ہیں کہ فلاں بزرگ تو اتنے بڑے عالم تھے، انھوں نے اپنی کتاب میں یہ روایات بیان کی ہیں، یا عرصۂ دراز سے اہل حدیث ان پر عمل کرتے چلے آ رہے ہیں، یا ہم شیخ البانی کے یا فلاں محقق کے مقلد تھوڑے ہی ہیں!

یہ کہنے والے اگرچہ تعداد میں نہایت ہی تھوڑے ہیں لیکن ہم ان سے یہ گزارش کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ ان کی مذکورہ باتیں یکسر سطحی بھی ہیں اور اُس مسلکِ محدثین سے انحراف بھی، جس کے حامل اور عَلَم بردار اہل حدیث ہیں۔ علاوہ ازیں ان کی باتیں اُس مقلدانہ ذہن کی غماز ہیں جس کے خلاف اہل حدیث نے بھرپور جہاد کیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ جن بزرگوں نے وہ روایات اپنی بعض تالیفات میں درج کی ہیں، تو انھوں نے تحقیق کے بغیر درج کر دی ہیں، ان کی تحقیق کی طرف انھوں نے توجہ نہیں دی، اس لیے وہ تو یقیناً معذور ہیں اور جو حضرات اب تک اِن پر عمل کرتے آئے ہیں، وہ بھی ماُجور ہی ہوں گے، اِس لیے کہ ان کی نیت حدیث پر عمل کرنے کی تھی اور وہ إِنْ شَاءَ اللّٰہُ، اللہ تعالیٰ کے ہاں عامل بالحدیث ہی شمار ہوں گے۔ لیکن اب یا کسی وقت بھی ان کا ضعف ثابت ہو گیا، تو پھر ایسی احادیث پر عمل کا کوئی جواز نہیں ہوگا۔ ضعف ثابت ہونے کے بعد ان پر محض اِس لیے عمل کرنا

کہ فلاں بزرگ یہ لکھ گئے ہیں، یا فلاں بڑے عالم نے اسے اپنی کتاب میں درج کیا ہے، یا ان پر عمل کرتے ہوئے ہماری عمریں گزر گئی ہیں۔ یہ سب باتیں محدثین کے منہج کے خلاف ہیں، اہل حدیث کے مزاج و تربیتِ صحیح کے خلاف ہیں اور اِسی تقلیدی ذہنیت کا مظاہرہ ہے جس کو اہل حدیث بجا طور پر حرام قرار دیتے ہیں۔

باقی رہی بات شیخ البانی رحمہ اللہ یا کسی اور محقق کی۔ تو ان کی کسی تحقیق کی روشنی میں کسی سابقہ بڑے عالم اور بزرگ کی بات کو یا ان کی درج کردہ ضعیف حدیث کو چھوڑ دینا، یہ شیخ البانی یا کسی محقق کی تقلید نہیں، بلکہ عین منہجِ محدثین ہے، جس کے داعی و عَلَم بردار اہل حدیث ہیں۔ شیخ البانی یا کسی اور کی بات اس لیے نہیں مان لی جاتی ہے کہ وہ کوئی مامور من اللہ ہیں یا ان کو مامور من اللہ باور کرلیا گیا ہے، بلکہ ان کی بات صرف اس لیے مانی جاتی ہے کہ انھوں نے محدثانہ اصول ہی کی روشنی میں احادیث کی تحقیق کی ہے، اِسی لیے جہاں اُن سے غلطی ہوئی ہے یا ان کی کسی فکر میں منہجِ محدثین سے انحراف ہے، وہاں ان کی باتیں بھی مردود ہیں اور اس کی کئی مثالیں موجود ہیں جن سے اہلحدیث نے شدید اختلاف کیا ہے۔ لیکن ان کی بعض غلطیوں یا ان سے اختلاف کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی جلیل القدر خدماتِ حدیث کو اہمیت نہ دی جائے یا ان کی خدمات و تحقیقات سے استفادہ کرنے والوں کو اُن کا مقلد قرار دے دیا جائے۔

یہ تو بالکل وہی بات ہے جو بعض جاہل قسم کے لوگ اہل حدیثوں کی بابت کہتے ہیں کہ ہم فلاں کے مقلد ہیں، تو تم بھی تو امام بخاری وغیرہ کے مقلد ہو۔ ہم فلاں فقہ کی پابندی کرتے ہیں، تو تم بھی تو صحیح بخاری وغیرہ کی پابندی کرتے ہو۔ کیا ان کی بات صحیح ہے؟ یہ الزام درست ہے؟ نہیں، یقیناً نہیں، اس لیے کہ ہم امام بخاری کے مقلد تھوڑے ہی ہیں، وہ تو نبی ﷺ کی احادیث ہم تک پہنچانے والے ہیں۔ ہم نے تو صرف اُن کی امانت و دیانت اور تحقیق پر اعتماد کیا ہے۔ بات تو ہم نے اللہ کے رسول ہی کی مانی ہے جس کی بات کے ماننے

کا حکم اللہ نے دیا ہے۔ اس کا تقلید سے کیا واسطہ؟ اِسی طرح شیخ البانی وغیرہ محققین کی تحقیقات ہیں جن کی امانت و دیانت اور تحقیق پر اعتماد کیا جاتا ہے کیونکہ انھوں نے بھی اس دور میں وہی کام کیا ہے جو اس سے پہلے ائمۂ حدیث اور فقہائے محدثین نے کیا ہے۔ اس کا بھی تقلید سے کیا واسطہ؟

ایک اور خلط مبحث یا خلافِ حقیقت تعبیر

بعض حضرات خلط مبحث کا ارتکاب کر کے اہل علم و تحقیق کے بعض علمی اختلافات کو بنیاد بنا کر یہ بات بھی کہہ رہے ہیں کہ بعض محقق یہ کہہ رہے ہیں، اور دوسرے حضرات اس کے برعکس یا اس سے قدرے مختلف یہ بات کہہ رہے ہیں۔ اور پھر تحقیق، یا استنباط، یا فہم کے اس اختلاف کو انتشارِ فکر سے تعبیر کر رہے ہیں یا اسے بھی سابقہ علماء سے اختلاف کا نتیجہ قرار دے رہے ہیں، حالانکہ یہ دونوں ہی باتیں غلط ہیں۔ تحقیق کا اختلاف یا فہم و استنباط کا اختلاف تو ایسا اختلاف ہے جو ہمیشہ سے چلا آ رہا ہے اور اسے آئندہ بھی بالکلیہ ختم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ صحابہ و تابعین کے عہد میں بھی تھا، فہمِ حدیث اور اس سے اخذِ مسائل میں محدثین کے درمیان بھی یہ اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس قسم کا علمی اختلاف علمائے اہلحدیث کے درمیان بھی ہے اور رہے گا۔ اسے فکری انتشار سے تعبیر کرنا یا علمائے مرحومین سے اختلاف کا نتیجہ قرار دینا یکسر غلط اور حقائق کو مسخ کرنا ہے۔ بات کی وضاحت کے لیے چند مثالیں یہاں پیشِ خدمت ہیں۔

① جیسے عاشورے (10 محرم) کے دن روزہ رکھنے کا مسئلہ ہے، نبی ﷺ یہ روزہ رکھا کرتے تھے، لیکن جب آپ کے علم میں یہ بات آئی کہ یہودی بھی عاشورے کا روزہ رکھتے ہیں، اور اس طرح ان سے موافقت یا مشابہت ہو جاتی ہے، تو آپ نے یہودیوں کی مخالفت کے نقطۂ نظر سے فرمایا:

«لَئِنْ بَقِيتُ إِلٰى قَابِلٍ لَأَصُومَنَّ التَّاسِعَةَ»

''اگر میں آئندہ سال زندہ رہا تو میں نویں محرم کا روزہ رکھوں گا۔''[1]

اس فرمانِ رسول کے فہم میں اختلاف ہوا، جس سے مسئلے کی نوعیت میں بھی اختلاف ہو گیا۔ علماء کے ایک گروہ نے کہا، اس کا مطلب ہے کہ میں صرف 9 محرم کا روزہ رکھوں گا، یعنی دس محرم کا روزہ نہیں، اس لیے وہ کہتے ہیں کہ اب صرف 9 محرم کا روزہ رکھنا مسنون عمل ہے۔ 10 محرم کا روزہ رکھنا بھی صحیح نہیں اور 10 محرم کے ساتھ 9 محرم کا روزہ ملا کر رکھنا بھی سنت نہیں۔ دوسرے علماء نے مذکورہ فرمانِ رسول کا مطلب یہ سمجھا کہ میں 10 محرم کے ساتھ 9 محرم کا روزہ بھی رکھوں گا کیونکہ 10 محرم کا روزہ تو آپ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نجات پانے کی خوشی میں رکھا تھا۔ اس اعتبار سے 10 محرم کے روزے کی مسنونیت تو مسلّم ہے، لیکن یہودیوں کی مخالفت کے لیے آپ نے اس کے ساتھ 9 محرم کا روزہ رکھنے کی بھی خواہش کا اظہار فرمایا جس پر عمل کرنے کا موقع آپ کو نہیں ملا۔ بعض دیگر روایات سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے۔ اسی لیے صاحبِ مرعاۃ مولانا عبیداللہ رحمانی، امام ابن القیم اور حافظ ابن حجر رحمہم اللہ وغیرھم نے اسی مفہوم کو زیادہ صحیح اور راجح قرار دیا ہے۔ (ملاحظہ ہو: مرعاۃ المفاتیح 270/3، طبع قدیم)

② دعائے قنوتِ وتر کا مسئلہ ہے، اس میں 3 مسئلے مختلف فیہ ہیں۔

دعائے قنوتِ وتر رکوع سے پہلے پڑھی جائے یا بعد از رکوع؟۔ اس میں روایات کی رُو سے راجح بات قبل از رکوع کی ہے، تاہم کچھ علماء بعد از رکوع کے بھی قائل ہیں۔

دوسرا مسئلہ ہے کہ دعائے قنوتِ وتر میں ہاتھ اُٹھائے جائیں یا ہاتھ اُٹھائے بغیر دعا پڑھی جائے۔ نبی ﷺ سے دعائے قنوتِ نازلہ میں (جو آپ نے ایک مہینہ پانچوں نمازوں

[1] صحيح مسلم، الصيام، باب أيّ يوم يُصام في عاشوراء ؟ ، حديث : 1134

میں پڑھی) ہاتھوں کا اُٹھانا ثابت ہے، جو علماء دعائے قنوتِ وتر میں ہاتھ اُٹھانے کے قائل ہیں، وہ دعائے قنوتِ نازلہ پر قیاس کر کے، قنوتِ وتر کے لیے بھی ہاتھ اُٹھانے کا اثبات کرتے ہیں، علاوہ ازیں بعض صحابہ کا عمل بھی اس کا مؤید ہے (جو قیام اللیل، للمروزی میں دیکھا جا سکتا ہے۔)

تیسرا مسئلہ دعائے قنوت پڑھنے کے بعد ہاتھوں کو مُنہ پر پھیرنے کا ہے۔ عام رواج تو ہاتھوں کا منہ پر پھیرنا ہی ہے، لیکن یہ عمل کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں ہے، اس لیے علمائے محققین اس سے روکتے ہیں۔ البتہ عام دعا کرنے کے بعد منہ پر ہاتھ پھیرنا جائز ہے اور اس کی دلیل بعض صحابہ کا عمل ہے۔ کسی صحیح حدیث سے اس کا بھی ثبوت مہیا نہیں ہوتا۔

اس میں ایک مسئلہ دعائے قنوت میں "نَسْتَغْفِرُكَ وَنَتُوبُ إِلَيْكَ" کے پڑھنے نہ پڑھنے کا بھی ہے۔ یہ دعائے قنوت "حصن حصین" میں ان الفاظ کے ساتھ موجود ہے، لیکن ظاہر بات ہے کہ "حصن حصین" حدیث کی کتاب نہیں ہے، بلکہ دعاؤں کا مجموعہ ہے اور اس میں ضعیف روایات بھی ہیں۔ جب براہِ راست کتب احادیث میں یہ الفاظ تلاش کیے گئے، تو محولہ کتب حدیث میں، یہ دعائے قنوت "نَسْتَغْفِرُكَ وَنَتُوبُ إِلَيْكَ" کے بغیر ہے، اس لیے علمائے محققین نے کہا کہ یہ الفاظ نہ پڑھے جائیں کیونکہ یہ ثابت نہیں ہیں۔

لیکن کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ بعض بزرگوں کی کتابوں میں یہ دعا ان الفاظ کے ساتھ ہے، اس لیے اس کو اِسی طرح پڑھنا چاہیے۔ اب یہ کیسی عجیب بات ہے کہ ان الفاظ کا وجود تو محولہ کتبِ حدیث میں نہیں ہے، لیکن ان کے پڑھنے پر اس لیے اصرار کیا جائے کہ بعض بزرگوں نے اس دعا کو ان الفاظ کے ساتھ اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے، حالانکہ ان الفاظ کی صحت پر اصرار ہے تو اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ان الفاظ کو محدثانہ منہج اور اصول سے ثابت کیا جائے اور حدیث کی کسی کتاب سے ان کو نکال کر دکھایا جائے۔ جب تک ایسا نہیں کیا جائے گا، اُن

حضرات کا موقف ہی صحیح سمجھا جائے گا جو ان الفاظ کو غیر ثابت قرار دے رہے ہیں۔

تاہم دعائے قنوت کی بابت پہلے تین مسئلوں کے اختلاف کی بنیاد چونکہ دلائل پر یا عملِ عام (رواج) پر ہے، اس لیے ان میں راجح موقف ان کا ہوگا جن کی دلیل زیادہ مضبوط ہوگی، بصورتِ دیگر دونوں صورتیں جائز متصور ہوں گی۔ اور عملِ عام (رواج) عدمِ دلیل کی وجہ سے قابلِ ترک ہوگا، جیسے دعائے قنوت کے بعد ہاتھوں کا منہ پر پھیرنا حدیث سے ثابت ہے نہ عمل صحابہ سے۔ اس لیے اس کا ترک ضروری ہوگا۔ اِلّا یہ کہ اس کو دلیل سے ثابت کر دیا جائے۔

③ رکوع کے بعد ہاتھ باندھنے کا مسئلہ ہے، بعض علماء نے سنن نسائی کی ایک روایت کے عموم سے استدلال کرتے ہوئے قومے میں (بعد از رکوع) ہاتھ باندھنے کو ضروری قرار دیا، جب کہ دوسرے علماء نے اس استدلال سے اتفاق نہیں کیا اور اِس کا مفہوم یہ بیان کیا کہ آپ جب بھی نماز کے لیے قیام فرماتے، تو ہاتھ باندھ لیتے۔ ''اِذَا قَامَ'' سے مراد نماز کا اولین قیام ہے کہ جب بھی نبی ﷺ نماز پڑھنے کی نیت سے کھڑے ہوتے، تو (تکبیرِ تحریمہ کے بعد) ہاتھ باندھ لیتے، نہ کہ مطلق قیام، جس میں رکوع کے بعد کا قومہ بھی شامل ہو جائے، کیونکہ اگر نبی ﷺ نے رکوع کے بعد بھی ہاتھ باندھے ہوتے، تو صحابۂ کرام آپ کی کیفیتِ نماز میں اس کو بھی ضرور بیان کرتے۔ جب صحابہ نے یہ کیفیت بیان نہیں کی، تو ''اِذَا قَامَ'' کے عموم سے اس کا اثبات نہیں ہوسکتا۔ کسی خاص بات کے اثبات کے لیے دلیلِ خاص کا ہونا بھی ضروری ہے، اس کے بغیر اس کا اثبات نہیں ہوسکتا۔

④ اس کی ایک اور مثال یہ ہے کہ کھانا کھانے سے قبل اور اسی طرح وضو کرنے سے قبل بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پوری پڑھی جائے، یا صرف بسم اللہ کے الفاظ کا پڑھ

لینا ہی کافی ہے؟ علمائے اہل حدیث میں سے بعض نے کہا کہ بسم اللہ پوری پڑھی جائے، اور بعض نے کہا کہ چونکہ حدیث کے الفاظ ہیں ''سَمِّ اللّٰہَ'' (اللہ کا نام لو) تو صرف بسم اللہ ہی کے الفاظ پڑھے جائیں۔ یہ اختلاف صرف فہمِ حدیث کا اختلاف ہے۔ دونوں ہی رائیں ایسی ہیں کہ ان کی کچھ نہ کچھ بنیاد ہے، اس لیے یہاں راجح مرجوح کی بات تو ہوسکتی ہے، لیکن غلط کسی کو بھی نہیں کہا جا سکتا، مگر بعض لوگ اسے علمائے اہل حدیث کا باہمی تضاد اور تعارض قرار دے رہے ہیں۔

ناطقہ سر بہ گریباں ہے، اسے کیا کہیے؟

بہر حال اِس طرح فہمِ حدیث کا اختلاف یا قیاس و استنباط کا اختلاف یا حدیث کی صحت وضعف کی وجہ سے اختلاف اور بھی بعض مسائل میں اہل حدیث علماء کے مابین ہے۔ یہ علمی اختلافات اس بات کی دلیل ہیں کہ اہل حدیث کے ہاں کسی قسم کا تقلیدی جمود ہے، نہ اکابر پرستی کا سلسلہ۔ ان کے ہاں دلیل کی بنیاد پر بحث و مذاکرہ اور نقد و تحقیق کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اور جو بات، جب بھی، دلیل کی رُو سے راجح قرار پاتی ہے، وہی ان کا مسلک بن جاتی ہے اور دوسری بات مرجوح یا متروک قرار پاتی ہے۔ اِسی لیے اہل حدیث کے ہاں فقہ اہل حدیث کے نام سے کوئی متعین کتاب ایسی نہیں ہے جس کی پابندی ان کے ہاں ضروری سمجھی جاتی ہو۔ وہ ہر مسئلے میں احادیثِ صحیحہ اور فقہ الحدیث پر مرتب کتابوں سے براہِ راست استفادہ کرتے ہیں اور جو بات سمجھ میں آتی ہے، اُسی پر وہ عمل کرتے ہیں اور اپنے عوام کو بھی اُسی پر عمل کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ایسی تحقیق کرتے وقت ان کے کوئی ذہنی تحفظات ہوتے ہیں، نہ حزبی مفادات، نہ کسی کی شخصی عظمت ہوتی ہے اور نہ کسی قسم کا فقہی جمود۔ اس میں ان کے درمیان کوئی اختلاف واقع ہوتا ہے تو وہ فہم و استنباط اور تعبیر و توجیہ کا ہوتا ہے، جس میں دونوں توجیہوں اور تعبیروں پر عمل کی گنجائش ہوتی ہے، کیونکہ مقصد دونوں کا ایک ہی

ہوتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی بات پر عمل کرنا ہے، نہ کہ ان کو نظر انداز کر کے کسی تیسرے شخص کے قول اور رائے پر، بنا بریں اس علمی اختلاف کو تضاد و تعارض کہنا صحیح ہے، نہ اسے فکری انتشار سے تعبیر کرنا ہی درست ہے۔

6

عوام الناس سے ایک گزارش

ایک گزارش ہم ہر مکتب فکر کے عوام سے کرنا چاہتے ہیں اور وہ یہ کہ وہ کتب احادیث کے اُردو تراجم کو پڑھتے وقت ایک تو اپنی نیتوں کو خالص کریں، یعنی ان کے دل میں یہ نیت ہو کہ ہم نے حدیثِ رسول کو ہر صورت میں ماننا ہے اور اس کو دوسروں کی رائے کے مقابلے میں ترجیح دینی ہے۔

دوسرے، اللہ سے صحیح راستے کی رہنمائی کی دعا کریں، یہ ہم ہر نماز میں پڑھتے بھی ہیں۔ ﴿ اَهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ﴾ ''اے اللہ! ہمیں سیدھا راستہ دکھا'' لیکن ترجمہ نہ جاننے کی وجہ سے اس کا ہمیں صحیح معنوں میں احساس و شعور نہیں ہوتا۔ آپ دل کی گہرائیوں سے یہ دعا کریں، اور خاندانی طور پر یا مخصوص ماحول کے زیر اثر آپ نے جس مسلک کو اپنایا ہوا ہے، اس پر قانع نہ رہیں اور ہدایت کی طلبِ صادق اپنے دل میں پیدا کریں اور اس کے پانے کی دعا بھی کریں۔

تیسرے، اللہ نے آپ کو عقل و فہم سے نوازا ہے، اسے آپ اپنی دنیا بہتر سے بہتر بنانے

کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ہماری استدعا ہے کہ اسے آپ اپنی آخرت کے سنوارنے کے لیے بھی استعمال کریں۔ آپ دنیا کے اتنے ہی اسباب و وسائل پر قناعت نہیں کرتے جو آپ کو اپنے والدین سے ورثے میں ملتے ہیں، بلکہ آپ اپنی محنت اور جدوجہد کے ذریعے سے اس میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس دنیا کے لیے جو عارضی، فانی اور چند روزہ ہے اس کے لیے تو آپ شب و روز مصروف رہیں، زندگی کا ایک ایک لمحہ اس کے لیے وقف رکھیں، اپنی تمام توانائیاں اس پر صرف کرتے رہیں، آپ کی دوستیاں اور دشمنیاں بھی اسی محور پر گھومیں لیکن آخرت کی زندگی، جو دائمی ہے جسے فنا اور زوال نہیں، اس کی بہتری اور اصلاح کے لیے آپ کے پاس نہ کوئی وقت ہو اور نہ اس کے لیے آپ اپنی عقل و فہم کو استعمال کرنے کی ضرورت ہی محسوس کریں بلکہ انھی مذہبی روایات پر عمل کر لینے کو کافی سمجھتے رہیں جو آپ کو اپنے خاندان یا ماحول سے ورثے میں ملیں۔ یہ عدل و انصاف نہیں ہے، اللہ کی دی ہوئی نعمت عقل و فہم کا صحیح استعمال نہیں ہے۔ یہ اپنے نفس پر اور اپنی آل اولاد پر ظلم ہے۔ آپ اپنے آپ کو بھی اور اپنی آل اولاد کو بھی اس خسران آخرت سے بچانے کی کوشش کریں جو صراطِ مستقیم سے انحراف کی صورت میں آپ کا مقدر بن سکتا ہے۔ اور اس کا طریقہ وہی ہے جو ہم نے گزشتہ سطور میں بیان کیا ہے۔

اہل حدیث کا طرزِ عمل اور عند اللہ باز پُرس کا احساس

جہاں تک اہل حدیث کا تعلق ہے، وہ بھی یقیناً مذکورہ باتوں سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ اور الحمدللہ اہل حدیث اللہ عزوجل کو گواہ بنا کر کہہ سکتے ہیں کہ وہ حدیث کی صحت و ضعف کا فیصلہ کرنے میں کسی حزبی تعصب اور جانب داری کا مظاہرہ نہیں کرتے، اپنے ذہنی تحفظات کو سامنے نہیں رکھتے اور اپنے خاندان اور ماحول کے اثرات کو اس پر اثر انداز نہیں ہونے

دیتے، بلکہ پوری امانت و دیانت سے نقد و تحقیق کے محدثانہ اصول ہی کی روشنی میں احادیث کو جانچتے اور پرکھتے ہیں اور پھر انھی مسائل کا اثبات یا ان کی أرجحیت کا فیصلہ کرتے ہیں جو احادیثِ صحیحہ کا اقتضاء ہے۔ احادیث کو توڑ مروڑ کر ان کی دُور از کار تاویل کرنا، یا صحیح حدیث کو ضعیف اور ضعیف حدیث کو صحیح ثابت کرنا، یا بلا دلیل کسی حدیث کو ناسخ یا منسوخ قرار دینا، یہ سب طریقے اہل حدیث کے نزدیک دجل و تلبیس اور کِتمانِ حق کی ذیل میں آتے ہیں۔ وہ ان سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں اور دوسروں کو بھی پورے اعتماد اور اذعان سے یہ یقین دلاتے ہیں کہ ان کا دامن ان تمام چابک دستیوں سے یکسر پاک ہے۔ محدثانہ اصول کے انطباق میں ان سے غلطی ہوسکتی ہے، معلومات میں کمی یا ان تک عدم رسائی کی وجہ سے غلطی ہوسکتی ہے، فہم و استنباط میں ان سے غلطی ہوسکتی ہے لیکن ان کوتاہیوں میں الحمدللہ کسی قسم کی بددیانتی کا عنصر شامل نہیں ہے، مسلکی پس منظر کا دخل نہیں ہے، کسی اور جذبے اور مفاد کی اس میں کارفرمائی نہیں ہے۔ وَاللّٰہُ عَلٰی مَا نَقُوْلُ وَکِیْل.
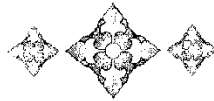
تلاشِ حق میں سرگرداں لوگوں تک اسلام کی دعوت پہنچانے کے لیے
انتہائی مستند، جامع اور دل پذیر کتابوں کا سیٹ، اردو میں پہلی بار

* توحید اور ہم
* رحمتِ عالم ﷺ
* قرآن کی عظمتیں اور اس کے معجزے
* اسلام کی امتیازی خوبیاں
* اسلام کے بنیادی عقائد
* اسلام میں بنیادی حقوق
* اسلام کی سچائی اور سائنس کے اعترافات
* اسلام پر 140 اعتراضات کے عقلی و نقلی جواب
* اسلام ہی ہمارا انتخاب کیوں؟
* میں توبہ تو کرنا چاہتا ہوں لیکن!
* جنت میں داخلہ، دوزخ سے نجات

مسلمانوں کی عملی زندگی میں مسنون انقلاب برپا کرنے والی کتب کا دعوتی، مستند اور جامع سیٹ

خود پڑھیے اور دوسروں کو ہدیہ کیجیے!

* ترجمہ و تفسیر تیسواں پارہ
* تجلیات نبوت
* ارکانِ اسلام و ایمان
* مسنون نماز اور روزمرہ کی دعائیں
* اسلام کے احکام و آداب
* فکر و عقیدہ کی گمراہیاں اور صراطِ مستقیم کے تقاضے
* اسلامی آدابِ معاشرت
* حقوق و فرائض
* انسان......اپنی صفات کے آئینے میں
* دعوتِ حق کے تقاضے
* لباس اور پردہ

عظمتِ حدیث اوراس کے تقاضے

حدیث کی عظمت و اہمیت کا تعلق براہ راست رسول اللہ ﷺ کی عظمت و اہمیت سے ہے۔ جو شخص بھی رسول اللہ ﷺ کی عظمت کو اس طرح تسلیم کرتا ہے جس طرح کہ ایک مسلمان کے شایانِ شان ہے اور جس کے نمونے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے عمل و کردار میں ملتے ہیں۔ وہ حدیثِ رسول کی عظمت و اہمیت کو بھی ضرور کما حقہ تسلیم کرے گا۔

حدیث کی عظمت و اہمیت کو کما حقہ تسلیم کرنے کا مطلب کیا ہے؟ یہ کہ اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا جائے، اس کے مقابلے میں کسی امام یا بزرگ کی رائے کو اہمیت دی جائے نہ فقہی جمود کا مظاہرہ کیا جائے، اکابر پرستی کا ثبوت دیا جائے نہ مسلکی عصبیت کا، اپنے مفادات کو اہمیت دی جائے نہ اپنے افکار و آراء کو، رسم و رواجِ دنیا کو فوقیت دی جائے نہ اپنے جذبات واحساسات کو۔

لیکن ہوتا کیا ہے؟ ہوتا بالعموم اس کے برعکس ہے۔ اِلاَّ مَاشَاءَ اللّٰه. اور ستم ظریفی کی انتہاء ہے کہ عظمتِ حدیث کے منکر صرف وہی لوگ نہیں ہیں جو حدیث کے ماخذِ شریعت اور حجت ہونے کے قائل نہیں بلکہ وہ لوگ بھی منکر ہیں جو حدیث کی تشریعی حیثیت اور حجیت کے قائل ہیں۔

ایسے لوگ حدیث کی عظمت اور اس کے تقاضوں سے کس طرح انحراف کرتے ہیں؟ اور یہ کون لوگ ہیں؟ اور اس کے اسباب وعوامل کیا ہیں؟

اس کتاب کا یہی موضوع ہے۔

اس میں بیگانوں کے ساتھ ''اپنوں'' کی کرم فرمائیاں بھی ملاحظہ فرمائیں تا کہ حدیث کی عظمت اور اس کے تقاضے واضح بھی ہو جائیں اور دل و دماغ پر نقش بھی کہ اس کے بغیر مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰه (النساء:٤/٨٠) ''جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی'' پر عمل ممکن نہیں۔

دارُالسّلام
کتاب وسنت کی اشاعت کا عالمی ادارہ
ریاض • جدہ • شارجہ • لاہور • کراچی
اسلام آباد • لندن • هیوسٹن • نیو یارك